زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

اشراق

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

ماہ نامہ

دسمبر ۲۰۲۳ء

مدیر: سید منظور الحسن

اشراق آڈیو

مدیر آڈیو: محمد حسن الیاس

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

اشراق

ماہ نامہ

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

مدیر

سید منظور الحسن

جلد ۱ شمارہ ۵ دسمبر ۲۰۲۳ء جمادی الاول ۱۴۴۵ھ

مدیر آڈیو اشراق: محمد حسن الیاس مدیر انتظامی: فرحان سید

مجلس تحریر: ریحان احمد یوسفی، ڈاکٹر عمار خان ناصر، ڈاکٹر عرفان شہزاد، محمد ذکوان ندوی، نعیم بلوچ

معاون مدیر: شاہد محمود

فہرست

شذرات

"نظم قرآن" کے ناقدین کا مخمصہ — سید منظور الحسن — 3

غامدی صاحب سے ہمارا اختلاف — محمد حسن الیاس — 7

قرآنیات

البیان: البقرہ 2: 82-61 (4) — جاوید احمد غامدی — 9

معارف نبوی

احادیث — جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس — 14

مقامات

رفیق صبوحی — جاوید احمد غامدی — 15

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

دین و دانش

شق القمر: غامدی صاحب کا موقف (5) — سید منظور الحسن — 18

نقطۂ نظر

یہود اور خدا کا فیصلہ — خورشید ندیم — 23

جسمانی سزا اور تشدد پسندی کی نفسیات — ڈاکٹر عرفان شہزاد — 27

انجیل میں "ابن اللہ" کے معنی — سید عکاشہ — 33

نقد و نظر

"نظم قرآن" پر ایک تنقید کی حقیقت — سید منظور الحسن — 35

سیر و سوانح

حیاتِ امین (4) — نعیم احمد بلوچ — 40

ادبیات

مے خانہ — جاوید احمد غامدی — 52

صبحِ درخشاں (بچوں کے لیے)

نیا لباس (منظوم حدیث) — سید منظور الحسن — 54

حالات و وقائع

خبر نامہ "المورد امریکہ" — شاہد محمود — 56

سید منظور الحسن

''نظم قرآن'' کے ناقدین کا مخمصہ

علوم کے اصول و قواعد اُس کے مظاہر میں فطری طور پر کار فرما ہوتے ہیں۔ یہ وہ حقائق ہوتے ہیں، جو اُن مظاہر کی تنظیم و تشکیل کا کردار ادا کرتے ہیں۔ اِن کی حیثیت خارجی عوامل کی نہیں، داخلی عناصر کی ہوتی ہے۔ علما و ماہرین اِنھیں مظاہر اور اُن کے متعلقات سے اخذ کر کے خاص ترتیب میں بیان کر دیتے ہیں۔ اِس کا مقصد مظاہر کی تفہیم و تسہیل ہوتا ہے۔[1]

یہ بیانِ واقعہ ہے، اِس کے درجِ ذیل نتائج مسلم ہیں:

اول، اصول و قواعد واقعاتی ترتیب میں اطلاقات و انطباقات سے مؤخر ہوتے ہیں۔ تعلیم و تعلم کی ضرورت کے پیشِ نظر اُنھیں بہ طور مقدمہ پیش کیا جاتا ہے۔

دوم، اصولوں اور اطلاقات کا باہمی تعلق لازم و ملزوم کا ہے۔ اصول اطلاقات سے مستنبط ہوتے اور اطلاقات اصولوں سے سمجھے جاتے ہیں۔ دونوں کو الگ الگ کر کے نہ سمجھا جا سکتا اور نہ سمجھایا جا سکتا ہے۔

سوم، اگر کسی مظہر کے علمی اصول مرتب نہیں ہوئے تو اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مظہر

---

[1]۔ اِسی تناظر میں مظاہر کو اطلاقات سے تعبیر کیا جاتا ہے، دراں حالیکہ اُن کی نوعیت مآخذِ اصول کی ہوتی ہے۔

اصول و قواعد کی پابندی سے آزاد ہے۔ مطلب فقط یہ ہے کہ اہل علم نے اُس پر غور کے اُس کے اصولوں کو اخذ نہیں کیا۔

اِس امر کو چند مثالوں سے سمجھنا مناسب ہو گا:

'عروض' وہ علم ہے، جس سے شعروں کے اوزان کی تعلیم حاصل ہوتی ہے۔ اہلِ ادب جانتے ہیں کہ یہ علم شاعری سے مقدم نہیں، بلکہ مؤخر ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہوا کہ پہلے عروض کے اصول وضع کیے گئے اور پھر اُن کے اطلاق سے شاعری وجود میں آئی۔ واقعہ یہ ہے کہ شاعری ہمیشہ سے موجود تھی، پڑھی اور سمجھی بھی جاتی تھی اور اُس کے موزوں اور غیر موزوں اجزا میں تفریق بھی قابل فہم تھی۔ دوسری صدی ہجری میں خلیل بن احمد نے عربی شعرا کے کلام کو سامنے رکھا اور اُس کی بنیاد پر 15 بحریں متعین کیں، بعد میں اہل ایران نے فارسی کلام کو سامنے رکھتے ہوئے چند مزید بحروں کا اضافہ کیا۔

'زبان و ادب' کے علوم ـــ صَرف، نحو، بیان، بدیع ـــ کے جملہ اصول و قواعد خود زبان و ادب ہی سے اخذ کیے گئے ہیں۔ ماہرینِ لسانیات نے نظم و نثر اور خطبات و مکالمات کے ادب پاروں کو سامنے رکھا ہے اور اسم، فعل، حرف؛ فعل، فاعل، مفعول؛ تشبیہ، استعارہ، مجاز، کنایہ اور تضاد، مبالغہ، تعلیل، تجنیس کے مختلف اور متنوع اصول متعین کیے ہیں۔ اِن میں سے کوئی چیز بھی زبان و ادب کے خارج سے داخل نہیں کی گئی۔

یہی معاملہ اسلامی علوم کا ہے۔ تفسیر کی کتابیں مقدم ہیں اور اصول تفسیر کی کتب مؤخر ہیں ـــ بلکہ اِن میں سے بیش تر دورِ حاضر میں تالیف ہوئی ہیں۔ حدیث کے مجموعے پہلے مرتب ہوئے اور اُس کے رد و قبول اور فہم کے اصول بعد میں ترتیب پائے ہیں۔ فقہ اور تاریخ و سیرت کی بھی یہی صورت ہے۔ چنانچہ اِن علوم میں اصل حیثیت تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت کے متون کی ہے، جو ایک پہلو سے اصولوں کا ماخذ اور دوسرے پہلو سے اُن کا اطلاق قرار پاتے ہیں۔ لہٰذا اِن علوم کے اصولوں کو اُن کے مآخذ اور اطلاقات سے الگ کر کے سمجھنا ممکن ہی نہیں ہے۔

یہ تقریر عالم شہود کے جملہ علوم سے متعلق ہے۔ اُن علوم کا معاملہ اِس سے بالکل مختلف ہے، جو تخیلی، باطنی اور روحانی واردات اور ماوراء الطبیعیاتی احوال کی جستجو کے لیے وضع کیے جاتے ہیں۔ یہ علوم چونکہ معدوم و موہوم پر غور و فکر کے مقصد سے تشکیل پاتے ہیں، اِس لیے اِن کے اصولوں کی

تخریج کے لیے مشہود، محسوس اور مجسم مظاہر غیر موجود ہوتے ہیں۔ گویا نہ وہ مصادر فراہم ہوتے ہیں، جن سے اصولوں کا استخراج کیا جا سکے اور نہ وہ مظاہر دستیاب ہوتے ہیں، جن پر مستخرجہ اصولوں کا اطلاق کیا جا سکے۔ لہٰذا اِن علوم میں نہ اصول تشکیل پاتے ہیں اور نہ اُن کے اطلاق کی ضرورت پیش آتی ہے۔

اِن علوم میں اصولوں کی جگہ مزعومات، قیاسات، احتمالات اور متخیلات ہوتے ہیں، جنھیں تفہیم مدعا کی خاطر یا تمہید کلام کے پیشِ نظر یا تعلیم و تدریس کی غرض سے اصولوں کے پیرائے میں بیان کر دیا جاتا ہے۔ غیر واضح چیزوں کی تحقیق و جستجو کے لیے یہ طریقہ غلط نہیں ہے۔ سائنس جیسے خالص مادی علم میں بھی جب نامعلوم حقائق کی تحقیق پیشِ نظر ہو تو اِسی طرح قیاسات اور مفروضات کو اساس بنایا جاتا ہے۔ حیاتیات میں ارتقا اور طبیعیات میں بگ بینگ کے تصورات اِسی کی مثال ہیں۔[2]

اِس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ عالمِ شہود کے مصادرِ علوم اور عالم خیال[3] کے مصادرِ علوم ایک دوسرے سے یک سر مختلف ہیں۔ ایک کے مصادر مشہود اور دوسرے کے غیر مشہود ہیں۔ ایک کے علوم اصول و قواعد پر اور دوسرے کے مفروضات اور قیاسات پر مبنی ہیں۔ لہٰذا نہ اِن کا تقابل ہو سکتا ہے، نہ ایک کو دوسرے پر قیاس کیا جا سکتا ہے، نہ ایک کے اصولوں کا دوسرے پر اطلاق ممکن ہے، نہ ایک کے زاویۂ نظر سے دوسرے کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ایک کے تناظر میں دوسرے کا محاکمہ کیا جا سکتا ہے۔

''نظم قرآن'' کے ناقدین کا مخمصہ یہ ہے کہ وہ موخر الذکر علوم کے دائرے میں کھڑے ہو کر مقدم الذکر طرز کے ایک علم پر جرح کر رہے ہیں۔[4] یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تنقید میں علوم اسلامی کے روایتی اسالیب اور مسلمہ اصولوں کو اختیار ہی نہیں کرتے۔ اپنے نقد کے دلائل میں وہ نہ قرآن و

---

[2]۔ یہی وجہ ہے کہ مثال کے طور پر علماے تصوف طریقت اور شریعت کے علوم کو ہمیشہ الگ الگ بیان کرتے اور الگ الگ طریقے سے سمجھتے اور سمجھاتے ہیں۔

[3]۔ یہ اصطلاحات فقط تفہیم مدعا کے لیے وضع کی گئی ہیں۔

[4]۔ یعنی تفسیر اور اصولِ تفسیر پر۔

حدیث کے نصوص پیش کرتے ہیں، نہ تاریخ و سیرت کا حوالہ دیتے ہیں، نہ زبان و ادب سے استشہاد کرتے ہیں اور نہ علوم اسلامی کے جلیل القدر علما کی آرا کو بہ طورِ شہادت نقل کرتے ہیں۔ ہر بات، ہر گفتگو، ہر تحریر مجردات سے شروع ہوتی اور مجردات پر ختم ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ علوم اسلامی کے علما کے لیے بے محل اور طلبہ کے لیے بے معنی قرار پاتی ہے۔

اُنھیں اِس مخمصے کا ادراک کرنا چاہیے اور اِس حقیقت کو باور کرنا چاہیے کہ غامدی صاحب کے تصورِ نظم قرآن پر اُن کی تنقید اُسی صورت میں لائق اعتنا اور قابلِ فہم ہو گی، جب وہ اُسے اسلامی علوم کی روایت کے اندر کھڑے ہو کر پیش کریں گے اور ''البیان'' کے مندرجات پر اُس کا اطلاق کر کے دکھائیں گے۔

محمد حسن الیاس

غامدی صاحب سے ہمارا اختلاف

یہ سوال مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ آپ کو غامدی صاحب کی کسی رائے سے اختلاف بھی ہوتا ہے؟

میں اس کے جواب میں ہمیشہ دو باتیں عرض کرتا ہوں:

پہلی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہم جیسے لوگوں کو ایک متوسط ذہن کے ساتھ پیدا کیا ہوتا ہے۔ ہم کسی نئے نظریے کے خالق بننے کی صلاحیت لے کر دنیا میں نہیں آتے۔ ہم دستیاب نظریات ہی میں سے کسی نظریے کا انتخاب کرتے ہیں۔ اِس انتخاب کے دوران میں ہم سوال بھی قائم کرتے ہیں، اعتراض بھی اٹھاتے ہیں، متردد بھی ہوتے ہیں، اختلاف بھی کرتے ہیں، مگر یہ سارا عمل فہم کے دائرے سے متعلق ہوتا ہے۔ اِس کے نتیجے میں بعض اوقات ہم اُس نظریے کو قبول کرتے ہیں اور بعض اوقات رد کرتے ہیں۔ اگر ہم علم کے سچے طالب ہیں تو ہمارا یہ طرز عمل عمر بھر قائم رہتا ہے۔

میں نے جب اپنی علمی زندگی کا آغاز کیا تو روایتی تعبیر دین کی بہت سی باتوں پر تردد پیدا ہوا۔ کئی سوالات مرتب ہوئے۔ اُن کے جواب روایتی تعبیر کے اعلیٰ دماغوں کی جانب سے بھی سامنے آئے اور غامدی صاحب کے فکر کی جانب سے بھی۔ میں نے اپنی عقل اور شعور کی روشنی میں تقابلی طریقے پر دونوں کو سمجھنے کے سفر کا آغاز کیا۔ خود اس عمل سے گزرنے میں سالوں لگ گئے، ایک لمبا عرصہ غامدی صاحب کے زاویۂ نظر سے استدلال کی بنیادیں سمجھنے میں صرف ہوا، تب جا کر اس کے اصولی مقدمات واضح ہوئے اور ان سے اتفاق پیدا ہوا۔ اب اگر غامدی صاحب کی فکر میں کسی چیز پر تردد، ابہام یا سوال پیدا ہوتا ہے تو لازماً وہی عمل ہوگا۔ یا غامدی صاحب جیسے بڑے لوگ

اسے سمجھا کر مطمئن کر دیں گے یا پھر کوئی دوسرا بڑا ذہن کوئی اور راہ دکھا دے گا تو اسے سمجھنے کے عمل کا آغاز ہو جائے گا۔

ہماری سطح کے لوگوں میں نہ روایتی تعبیر دین سے اختلاف پیدا کر کے کوئی متبادل فکر دینے کی اہلیت یا صلاحیت ہے، نہ غامدی صاحب کے نظام فکر پر تنقید اور اختلاف کر کے اس کا سقم واضح کرنا ہمارے بس کی بات ہے۔ چنانچہ ہم جیسے لوگ کسی بھی فکر کو اس کے اصولوں سے اتفاق کی روشنی میں اپناتے اور پھر اس میں کھڑے ہو کر غور و فکر اور اتفاق و اختلاف کے سلسلے کو جاری رکھتے ہیں۔ یہی ہماری صلاحتیوں کا حاصل ہوتا ہے۔

دوسرا پہلو خالصتاً انسانی ہے۔ اس نظر سے دیکھیں تو روزانہ غامدی صاحب کی بھی کئی باتیں ابتدا میں ایسے ہی سمجھ میں نہیں آتیں، جیسے روایتی تعبیر دین کی نہیں آتی تھیں یا آتی ہیں، چنانچہ وقتی نوعیت کا عدم اتفاق کہیے یا الجھن، پیدا ہو جاتی ہے۔ اس پر شب و روز بحثیں ہوتی ہیں، پیشکش کی بہتری کے لیے ذہن میں کئی تجاویز آتی ہیں، اس عمل کو کسی کے فکر سے اختلاف کے بجاے، اصولوں کے اطلاق کی مشق اور کسی بڑے فکر میں تعمق پیدا کرنے کا سفر قرار دینا چاہیے۔

تاہم ہم جیسے لوگ اس عدم اتفاق اور الجھنوں کو گوارا کر کے تضادات میں نہیں جی پاتے، بلکہ اسے رفع کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں، کیونکہ ہم کسی بھی مکتب فکر کو اس وقت تک نہیں اپنا سکتے جب تک وہ اصول سے اطلاق تک سدید نہ ہو اور تضاد سے پاک نہ ہو۔

یہ معاملہ الحمد للہ صبح آنکھ کھلنے سے لے کر رات سونے تک جاری رہتا ہے۔ غامدی صاحب سے اس نوعیت کے استفادے کا تعلق کم و بیش پندرہ سال پہلے شروع ہوا اور ہنوز جاری ہے۔ یہ سلسلہ جس دن رک گیا تو دو ہی صورتیں ہوں گی: یا ہم غامدی صاحب کے فکر کے مقلدِ محض بن جائیں گے یا پھر خود کو اُنھی کی طرح اصول سے اطلاق تک ایک مستحکم نقطۂ نظر اور منظم مکتب فکر قائم کرنے والی شخصیت تصور کرنے لگیں گے۔ دعا ہے کہ اللہ ہمیں اِن دونوں درجات سے محفوظ رکھے۔ اس لیے کہ پہلی صورت کا انجام عصبیت اور فرقہ بندی ہے، جو سراسر فساد ہے اور دوسری صورت کا نتیجہ بلا استعداد ''مجتہد'' بننا ہے، جو سراسر جہالت ہے۔ یہ دونوں نتائج علم کے دروازے کو بند کرنے والے ہیں، اس لیے ہم اِن سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرۃ

(4)

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

اور یاد کرو، جب تم نے کہا: اے موسیٰ، ہم ایک ہی کھانے پر ہرگز صبر نہ کریں گے۔ سو ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کرو کہ یہ سبزی، ککڑی، لہسن، مسور اور پیاز جو زمین اگاتی ہے، وہ اِن چیزوں میں سے ہمارے لیے نکال کر لائے۔ اُس نے کہا: تم ایک بہتر چیز کو کم تر چیزوں سے بدلنا چاہتے ہو؟ اچھا تو جاؤ، کسی مصر ہی میں جا رہو۔ اِس لیے کہ یہ جو کچھ تم مانگتے ہو، وہاں تم کو مل جائے گا۔ (وہ یہی کرتے رہے) اور اُن پر ذلت اور محتاجی مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کا غضب کما لائے۔ یہ اِس وجہ سے ہوا کہ وہ اللہ کی آیتوں کو نہیں مانتے تھے اور اُس کے نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ اِس وجہ سے ہوا کہ اُنھوں نے نافرمانی کی اور وہ (اللہ کی ٹھیرائی ہوئی) کسی حد پر نہ رہتے تھے۔ 61

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ الَّذِیۡنَ ہَادُوۡا وَ النَّصٰرٰی وَ الصّٰبِـُٔوۡنَ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَہُمۡ اَجۡرُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ۚ وَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۲﴾

وَ اِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَکُمۡ وَ رَفَعۡنَا فَوۡقَکُمُ الطُّوۡرَ ؕ خُذُوۡا مَاۤ اٰتَیۡنٰکُمۡ بِقُوَّۃٍ وَّ اذۡکُرُوۡا مَا فِیۡہِ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّیۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ ۚ فَلَوۡ لَا فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَ رَحۡمَتُہٗ لَکُنۡتُمۡ مِّنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۶۴﴾ وَ لَقَدۡ عَلِمۡتُمُ الَّذِیۡنَ اعۡتَدَوۡا مِنۡکُمۡ فِی السَّبۡتِ فَقُلۡنَا لَہُمۡ کُوۡنُوۡا قِرَدَۃً خٰسِـِٕیۡنَ ﴿۶۵﴾ فَجَعَلۡنٰہَا نَکَالًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہَا وَ مَا خَلۡفَہَا وَ مَوۡعِظَۃً لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۶۶﴾

وَ اِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِہٖۤ اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تَذۡبَحُوۡا بَقَرَۃً ؕ قَالُوۡۤا اَتَتَّخِذُنَا ہُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ اَنۡ اَکُوۡنَ مِنَ الۡجٰہِلِیۡنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوا ادۡعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنۡ لَّنَا مَا ہِیَ ؕ قَالَ اِنَّہٗ یَقُوۡلُ اِنَّہَا بَقَرَۃٌ لَّا فَارِضٌ وَّ لَا بِکۡرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَیۡنَ ذٰلِکَ ؕ فَافۡعَلُوۡا مَا تُؤۡمَرُوۡنَ ﴿۶۸﴾ قَالُوا ادۡعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنۡ لَّنَا مَا لَوۡنُہَا ؕ قَالَ اِنَّہٗ یَقُوۡلُ اِنَّہَا بَقَرَۃٌ صَفۡرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوۡنُہَا تَسُرُّ النّٰظِرِیۡنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا ادۡعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنۡ لَّنَا مَا ہِیَ ۙ اِنَّ الۡبَقَرَ تَشٰبَہَ عَلَیۡنَا ؕ وَ اِنَّاۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ لَمُہۡتَدُوۡنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ اِنَّہٗ یَقُوۡلُ اِنَّہَا بَقَرَۃٌ لَّا ذَلُوۡلٌ تُثِیۡرُ الۡاَرۡضَ وَ لَا تَسۡقِی الۡحَرۡثَ ۚ مُسَلَّمَۃٌ لَّا شِیَۃَ فِیۡہَا ؕ قَالُوا الۡـٰٔنَ جِئۡتَ بِالۡحَقِّ ؕ فَذَبَحُوۡہَا وَ مَا کَادُوۡا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۷۱﴾

(سو جزا و سزا کا قانون بالکل بے لاگ ہے، اِس لیے) وہ لوگ جو (نبی امی پر) ایمان لائے ہیں اور جو (اِن سے پہلے) یہودی ہوئے اور جو نصاریٰ اور صابی کہلاتے ہیں، اُن میں سے جن لوگوں نے بھی اللہ کو مانا ہے اور قیامت کے دن کو مانا ہے اور نیک عمل کیے ہیں، اُن کے لیے اُن کا صلہ اُن کے پروردگار کے پاس ہے اور (اُس کے حضور میں) اُن کے لیے نہ کوئی اندیشہ ہو گا اور نہ وہ کبھی غم زدہ ہوں گے۔62

اور یاد کرو، جب ہم نے تم سے عہد لیا تھا اور (اِس کے لیے) طور کو تم پر اٹھایا تھا اور کہا تھا کہ اُس چیز کو پوری قوت کے ساتھ پکڑو جو ہم نے تمھیں دی ہے، اور جو کچھ اُس میں (لکھا) ہے، اُسے یاد رکھو تاکہ تم (اللہ کے غضب سے) بچے رہو۔ پھر اِس کے بعد بھی تم اُس سے پھر گئے۔ سو حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ کی عنایت اور اُس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو (اپنے اِس رویے کی وجہ سے) تم بڑے نامراد ہوتے۔ اور تم اُنھیں بھی جانتے ہی ہو جنھوں نے تمھارے لوگوں میں سے سبت کی بے حرمتی کی تو ہم نے اُن سے کہا: جاؤ، ذلیل بندر بن جاؤ۔ اِس طرح اُن کی اُس بستی کو، (جس

وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَ قَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾ اَوَ لَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾ وَ مِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِيَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا

میں اُنھوں نے سبت کی بے حرمتی کی تھی)، ہم نے اُس کے گردوپیش کے لیے ایک نمونۂ عبرت اور خدا سے ڈرنے والوں کے لیے ایک ذریعۂ نصیحت بنا دیا۔66-63

اور یاد کرو، جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ (خون پر قسمیں کھانے کے لیے) تم ایک گائے ذبح کرو۔ وہ کہنے لگے: کیا تم ہم سے مذاق کرتے ہو؟ اُس نے کہا: میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ اِس طرح کا جاہل بن جاؤں۔ اُنھوں نے کہا: اچھا، اپنے رب کو ہمارے لیے پکارو کہ وہ ہمیں بتائے کہ گائے کیسی ہونی چاہیے۔ اُس نے کہا: وہ فرماتا ہے کہ گائے نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا، اِن کے بیچ کی میانہ ہو۔ اب جاؤ اور وہ کرو جس کا تمھیں حکم دیا جا رہا ہے۔ بولے: اپنے رب کو ہمارے لیے پکارو کہ وہ ہم پر یہ بھی واضح کرے کہ اُس کا رنگ کیسا ہو۔ اُس نے کہا: وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے سنہری ہو، شوخ رنگ، ایسی کہ دیکھنے والوں کو خوش آجائے۔ بولے: (ایک مرتبہ اور) اپنے رب کو ہمارے لیے پکارو کہ ہم کو اچھی طرح وضاحت کے ساتھ بتائے کہ وہ کیسی ہو، ہمیں گایوں میں کچھ شبہ پڑ رہا ہے، اور اللہ نے چاہا تو اب ہم ضرور اُس کا پتا پا لیں گے۔ اُس نے کہا: وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے محنت والی نہ ہو کہ زمین جوتتی اور فصلوں کو پانی دیتی ہو۔ وہ ایک ہی رنگ کی ہو، اُس میں کسی دوسرے رنگ کی آمیزش نہ ہو۔ بولے: اب تم واضح بات لائے ہو۔ اِس طرح اُنھوں نے اُس کو ذبح کیا اور لگتا نہ تھا کہ وہ یہ کریں گے۔71-67

بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا
النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗۤ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ
مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾

اور وہ واقعہ بھی یاد کرو، جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا۔ پھر (جھوٹی قسمیں کھائیں اور) اِس کا الزام ایک دوسرے پر دھرنے لگے، اور اللہ نے فیصلہ کر لیا کہ جو کچھ تم چھپا رہے تھے، وہ اُسے ظاہر کر دے گا۔ چنانچہ ہم نے کہا: اِس (مردے) کو اُسی گائے کا ایک ٹکڑا مارو (جو قسمیں کھانے کے لیے ذبح کی گئی ہے تو وہ زندہ ہو گیا)۔ اللہ اِسی طرح مردوں کو زندہ کرے گا اور وہ تمھیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھ سے کام لو۔ 73-72

(تم یہی کرتے رہے، یہاں تک کہ) اِس کے بعد پھر تمھارے دل سخت ہو گئے، اِس طرح کہ گویا وہ پتھر ہیں یا اُن سے بھی زیادہ سخت۔ اور پتھروں میں تو ایسے بھی ہیں جن سے نہریں پھوٹتی ہیں اور اُن میں ایسے بھی ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور اُن سے پانی بہ نکلتا ہے اور اُن میں ایسے بھی ہیں کہ اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ (یہ حقیقت ہے کہ تم یہی کرتے رہے ہو)، اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے بے خبر نہیں ہے۔ 74

اِس کے باوجود، (مسلمانو)، کیا تم (اِن سے) یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ تمھاری بات مان لیں گے؟ اور (یہ وہ لوگ ہیں کہ) اِن میں سے ایک گروہ اللہ کا کلام سنتا رہا ہے اور اُسے اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد جانتے بوجھتے، اُس میں تحریف کرتا رہا ہے۔ اور یہ (وہ لوگ ہیں کہ) جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے مان لیا ہے اور جب آپس میں اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: کیا تم اِن کو وہ بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولا ہے کہ وہ اِس کی بنیاد پر تمھارے پروردگار کے پاس تم سے حجت کریں۔ پھر کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟ کیا یہ نہیں جانتے کہ جو کچھ یہ چھپاتے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں، اللہ اُن سب باتوں سے باخبر ہے؟ اور (یہ وہ لوگ ہیں کہ) اِن میں بن پڑھے عامی بھی ہیں جو اللہ کی کتاب کو صرف (اپنی) آرزوؤں کا ایک مجموعہ سمجھتے ہیں اور اپنے گمانوں ہی پر چلتے ہیں۔ —— سو تباہی ہے اُن کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے شریعت تصنیف کرتے ہیں، پھر کہتے ہیں: یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اِس کے ذریعے سے تھوڑی سی قیمت حاصل کر لیں۔ سو تباہی ہے اُن کے لیے

اُس چیز کی وجہ سے جو اُن کے ہاتھوں نے لکھی اور تباہی ہے اُن کے لیے اُس چیز کی وجہ سے جو (اُس کے ذریعے سے) وہ کماتے ہیں۔ اور (یہ وہ لوگ ہیں کہ) اِنھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ دوزخ کی آگ ہمیں ہرگز نہ چھوئے گی۔ ہاں، گنتی کے چند دنوں کی تکلیف، البتہ ہو سکتی ہے۔ اِن سے پوچھو، کیا اللہ سے تم نے کوئی عہد لیا ہے؟ اِس لیے کہ اگر عہد لیا ہے تو اللہ کسی حال میں اپنے عہد کی خلاف ورزی نہ کرے گا یا تم اللہ پر ایسی تہمت باندھ رہے ہو جس کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتے۔ ہاں، کیوں نہیں، جن لوگوں نے کوئی بدی کمائی ہے اور اُن کے گناہ نے اُنھیں پوری طرح گھیر لیا ہے، وہی دوزخ کے لوگ ہیں، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جو ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے، وہی جنت کے لوگ ہیں۔ وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ 82-75

[باقی]

اے کہ ترے وجود سے راہِ حیات کا سراغ
اِس شبِ تار میں نہیں تیرے سوا کوئی چراغ

ترجمہ و تحقیق: جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس

— 1 —

حضرت اوسط بن اسمٰعیل بجلی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے رخصت ہو گئے تو اُنھوں نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پچھلے سال اِسی جگہ کھڑے تھے، پھر وہ (آپ کو یاد کر کے) رونے لگے، پھر کہا: آپ نے فرمایا تھا: تم اپنے لیے سچائی کو لازم کر لو، کیونکہ سچائی نیکی کے ساتھ ہے، اور یہ دونوں جنت میں ہوں گی۔ اور تم جھوٹ سے پرہیز کرو، کیونکہ جھوٹ برائی کے ساتھ ہے، اور یہ دونوں دوزخ میں ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ سے عافیت چاہو، اِس لیے کہ ایمان و یقین کے بعد کوئی چیز عافیت سے بڑھ کر نہیں ہے۔ تم آپس میں ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، بغض نہ رکھو، قطع تعلق نہ کرو اور باہم دشمنی نہ کرو، بلکہ اللہ کے بندے بھائی بھائی بن کر رہو، جیسا کہ اللہ نے تمھیں ہدایت فرمائی ہے۔ (ابن ماجہ، رقم 3847)

— 2 —

حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے میری طرف وحی کی ہے کہ تم لوگ تواضع اختیار کرو، یہاں تک کہ نہ تم میں سے کوئی کسی پر زیادتی کرے اور نہ کسی پر اپنی بڑائی کی دھونس جمانے کی کوشش کرے۔ (ابو داؤد، رقم 4252)

— 3 —

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ غرور و تکبر خیمے والوں میں ہے جو چِلّا کر بولتے ہیں اور وقار و اطمینان بھیڑ بکری والوں میں ہے۔ (مسلم، رقم 80)

مقامات

جاوید احمد غامدی

رفیق صبوحی

بار فیقان ز خود رفتہ سفر دست نداد
سیر صحرائے جنوں حیف کہ تنہا کردم

سرما کی آمد میرے لیے ہمیشہ بڑے اہتزاز کا باعث ہوتی ہے۔ تاروں کے ڈوبنے سے پہلے جب میں گیس کی انگیٹھی کے سامنے بیٹھ کر لپکتے شعلوں کو دیکھتا اور خیال و خامہ کو باہم رشتہ بپا کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو جمعیت خاطر کا جو سامان اُس وقت میسر ہوتا ہے، اُس کے بعد کسی بے سروسامانی کا غم باقی نہیں رہتا:

دل کہ جمع ست، غم از بے سروسامانی نیست
فکر جمعیت اگر نیست، پریشانی نیست

لیکن 27 نومبر کی صبح جب میں نے اِس موسم میں پہلی مرتبہ آتش فسردہ کو شعلہ باری کا اذن دیا تو میں نے دیکھا کہ میرے محسوسات کی دنیا اُس اہتزاز سے بالکل خالی ہے۔ کمرے کی انگیٹھی میں خاموش پڑی آگ تو دیا سلائی کا شعلہ دکھاتے ہی گویا ہو گئی، مگر اِس کے ساتھ لَے لینے کے لیے جو آواز اُس روز دل سے اٹھی، اُسے بس ایک نغمۂ خوں گشتہ ہی کہنا چاہیے:

آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں؟
سوز غم ہائے نہانی اور ہے

ہم جب زندگی کا سفر شروع کرتے ہیں تو اُس میں گاہے کچھ ساتھ چلنے والے بھی میسر آ ہی جاتے ہیں۔ یہ ہم سفر بارہا آپس میں وفا کے عہد باندھتے اور جو کچھ کہتے ہیں، اکثر اُس کو نباہ دینے کے لیے ایک دوسرے سے بڑی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں۔ پھر کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ وفا کے عہد ریت کے گھروندوں کی طرح بکھر جاتے اور توقعات کی دنیا صحرائے نجد کی طرح ویران ہو جاتی ہے۔ سفر کی ابتدا میں یہ خیال نہیں ہوتا کہ زندگی کی حقیقتیں اِس قدر تلخ ہوں گی، لیکن اُن کا زہر رگ وپے میں اترتا ہے تو اندر کا انسان باہر آ جاتا اور لوگ ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں۔ اُس وقت کوئی شخص اگر اپنی وفا پر قائم رہے تو اندوہ وفا کے سوا اُس کے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ جانے والے مشتاقانہ اپنی اپنی راہوں پر چلے جاتے ہیں اور وہ حرماں نصیب اپنے عزیز از جان عزیزوں کو خود گاڑی پر بٹھا کر اُسے اسٹیشن پر رینگتے دیکھتا اور پھر تنہا پلیٹ فارم پر کھڑا رہ جاتا ہے:

نہ گلہ ہے دوستوں کا، نہ شکایت زمانہ

اب سے کم و بیش نو برس پہلے نومبر کی اِسی 27 تاریخ کو میں نے اپنے کچھ عزیز از جان عزیزوں کو اِسی طرح رخصت کیا تھا۔ یہ دن ہر سال لوٹ کر آتا رہا، لیکن اِس کی یادوں کا آزار کبھی اِس طرح دل و دماغ پر حاوی نہیں ہوا۔ اب کیا پھر کوئی عزیز از جاں پا در رکاب ہو گا؟ میں آتش دان کے سامنے بیٹھا رہا اور میری زبان پر بے اختیار وہ شعر جاری ہو گئے جو اب سے نو برس پہلے میں نے اِن جانے والوں کی یاد میں کہے تھے:

مقام شرح جنوں پہ وہی سرور و حضور
نفس نفس وہی تنہا سرود نیم
مری نگاہ سرابوں کی آرزو کا وجود
کہاں سے آئے ندیموں میں ذوق تشنہ لبی
اِسی خطا پہ گریزاں ہیں ہم سفر میرے
کہ میری طبع رواں مصلحت شناس نہیں

وہ ہم سفر کہ زمانے میں جن کی دھوم ہوئی
مثال ماہ تھی تیرہ شبوں میں جن کی جبیں
مرے وجود میں پنہاں وجود کا حاصل
زبان شعر میں اپنے معلقات کہوں
مری نواؤں سے اب وہ بھی آشنا نہ رہے
مرے ندیم، میں شہر جنوں میں تنہا ہوں
مجھے رفیق صبوحی کی جستجو ہی رہی
مرے سبو کی حقیقت تہ سبو ہی رہی

[1988ء]

سید منظور الحسن

شق القمر

غامدی صاحب کا موقف

[محمد حسن الیاس کے ساتھ ایک مکالمے سے لیا گیا]

(5)

—2—

انفس و آفاق میں
معمول کے خلاف ظاہر ہونے والی آیاتِ الٰہی

قرآنِ مجید میں 'آیۃ' کا لفظ انفس و آفاق کی مافوق الفطرت نشانیوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ اِن سے مراد وہ احوال و واقعات ہیں، جو اللہ کی قدرت کے عظیم الشان مظاہر کے طور پر

خلافِ معمول رونما ہوتے ہیں۔ یہ پیغمبر کی وساطت سے نہیں، بلکہ اللہ کے براہِ راست حکم سے یا کارکنانِ قضاوقدر کے ذریعے سے واقع ہوتے ہیں۔ اِن کا ظہور شاذونادر اور ناگہاں ہوتا ہے، اِس لیے لوگ اِن کے بارے میں ناواقف اور غیر متوقع ہوتے ہیں۔ عرف وعادت اور عام دستور و قانون کے خلاف ہونے کی وجہ سے یہ حیرت واستعجاب کا باعث بنتے ہیں۔ لوگوں کو اِن کے بارے میں توجہ دلانے کی ضرورت نہیں پڑتی، اِن کی ندرت اور سنسنی خیزی از خود اُنھیں متوجہ کر لیتی ہے۔ اِس طرح کی آیات عام زمانے میں بھی ظاہر ہو سکتی ہیں، مگر زمانۂ نبوت ورسالت میں اِن کا ورود مقابلتاً زیادہ ہوتا ہے۔ اِن کا مقصد تنبیہ وتذکیر بھی ہوتا ہے، انعام واکرام بھی اور تکلیف و تعذیب بھی۔ ہر صورت میں یہ اِس طور سے ظاہر ہوتی ہیں کہ نہ اِنھیں معمول کا واقعہ سمجھ کر نظر انداز کیا جا سکتا اور نہ اتفاقی حادثہ قرار دے کر فراموش کیا جا سکتا ہے۔

قرآنِ مجید میں اِس نوعیت کی جن آیات کا ذکر ہوا ہے، اُن میں سے چند بہ طورِ مثال درج ذیل ہیں۔

1۔ عیسیٰ علیہ السلام کی بن باپ کے پیدایش اور گہوارے میں گفتگو

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا حضرت مریم علیہا السلام کے بطن سے بن باپ کے پیدا ہونا، اِسی طرح کا خارقِ عادت واقعہ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے براہِ راست حکم سے عمل میں آیا ہے۔ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے مریم اور ابنِ مریم، دونوں کو آیت قرار دیا ہے۔ سورۂ مومنون میں ارشاد فرمایا ہے:

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰيَةً.... (50:23)

”اور مریم کے بیٹے اور اُس کی ماں کو بھی ہم نے اِسی طرح ایک عظیم نشانی بنایا...۔“

سورۂ انبیا میں اِن دونوں ہستیوں کو ’اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ‘ (دنیا والوں کے لیے نشانی) کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ. (91:21)

”اور اُس خاتون پر بھی جس نے اپنا دامن پاک رکھا تو ہم نے اُس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور اُس کو اور اُس

کے بیٹے (عیسیٰ) کو دنیا والوں کے لیے
ایک نشانی بنادیا۔"

سورۂ مریم میں یہ واقعہ تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ اُس میں اِس اقدام کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے: 'وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا' یعنی مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مسیح علیہ السلام کو لوگوں کے لیے ایک نشانی اور اپنی طرف سے رحمت بنائیں۔ فرمایا ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا. فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۖ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا. قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا.

"(اب) اِس کتاب میں مریم کا ذکر کرو، جب وہ اپنے گھر والوں سے الگ ہو کر (بیت المقدس کے) مشرقی جانب گوشہ نشین ہو گئی تھی۔ اور اپنے آپ کو اُن سے پردے میں کر لیا تھا۔ پھر ہم نے اُس کے پاس اپنا فرشتہ بھیجا اور وہ اُس کے سامنے ایک پورے آدمی کی صورت میں نمودار ہو گیا۔ مریم (نے اُسے دیکھا تو) بول اٹھی کہ میں تم سے خدائے رحمٰن کی پناہ میں آتی ہوں، اگر تم اُس سے ڈرنے والے ہو۔

قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا. قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا.

اُس نے کہا: میں تمھارے پروردگار ہی کا فرستادہ ہوں اور اِس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تمھیں ایک پاکیزہ فرزند عطا کروں۔ مریم نے کہا: میرے ہاں لڑکا کیسے ہو گا، نہ مجھے کسی مرد نے ہاتھ لگایا ہے اور نہ میں کبھی بدکار رہی ہوں!

قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً

اُس نے کہا: اِسی طرح ہو گا۔ تمھارا پروردگار فرماتا ہے کہ یہ میرے لیے

مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمۡرًا مَّقۡضِيًّا. (16-21:19)

بہت آسان ہے۔ ہم یہ اِس لیے کریں گے کہ وہ ہمارا پیغمبر ہو اور اِس لیے کہ ہم اُس کو لوگوں کے لیے ایک نشانی اور اپنی طرف سے رحمت بنائیں۔ اور یہ بات طے کر دی گئی ہے۔‘‘

اِس تفصیل سے واضح ہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام کی بن باپ کے پیدایش ایک خارقِ عادت واقعہ تھا، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانی کے طور پر ظاہر کیا تھا۔ اِس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیدایش کے عام قانون سے ہٹ کر اپنا حکم براہِ راست نازل کیا اور اپنے کلمۂ ’کن‘ سے بطن مادر میں مولود کا استقرار کیا اور اُس میں اپنی روح پھونک دی۔ یہ اُسی طرح کا حکم تھا، جو اُس نے آدم و حوا کی پیدایش کے لیے نازل کیا تھا۔ یہ نشانی رہتی دنیا تک کے لیے تخلیق انسانی اور اُس کے اعادے کی دلیل کے طور پر نمایاں رہے گی۔ امام امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

’’حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خارقِ عادت ولادت قیامت کی بہت بڑی نشانی ہے۔ نادانوں کو قیامت پر سب سے بڑا شبہ یہی تو ہوتا ہے کہ آخر اسباب کے بغیر لوگ کس طرح دوبارہ پیدا ہو جائیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وجود اِس شبہ کا جواب ہے کہ ہر چیز اللہ کے کلمۂ ’کن‘ سے ظہور میں آتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اِسی کلمہ سے وجود میں آئے ہیں۔ چنانچہ اِسی بنیاد پر اُن کو انجیل اور قرآن، دونوں میں ’کلمۃ اللہ‘ کہا بھی گیا ہے۔‘‘ (تدبر قرآن 4/ 645)

سیدنا مسیح علیہ السلام کا گہوارے میں کلام کرنا اِسی آیت کا تسلسل ہے۔ سورۂ مریم ہی میں بیان ہوا ہے کہ اللہ کے حکم سے سیدہ مریم کو حمل ٹھہرا اور وہ اِس کے ساتھ اپنے علاقے سے دور چلی گئیں۔ پھر جب ولادت کا موقع آیا تو اُس وقت اللہ کا فرشتہ آیا، جس نے اُنھیں تسلی دی اور اُن کے لیے چشمہ جاری کیا۔ پھر اُنھیں ہدایت کی کہ وہ نومولود کو لے کر اپنی قوم میں واپس جائیں۔ وہ اگر کوئی سوال یا اعتراض کریں تو اشارے سے بتا دیں کہ اُنھوں نے چپ رہنے کا روزہ رکھا ہے۔ چنانچہ وہ واپس گئیں۔ بچے کو ساتھ دیکھ کر لوگوں نے اُن کی پاک دامنی پر تہمت لگانی شروع کی تو اُنھوں نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ لوگوں نے کہا کہ ہم اُس سے کیسے پوچھیں، جو نومولود ہے اور بولنے کی عمر کو نہیں پہنچا؟ اِس پر بچے نے بولنا شروع کر دیا۔ قرآنِ مجید کا بیان ہے:

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ۛ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا. وَجَعَلَنِی مُبٰرَکًا أَیْنَ مَا کُنْتُ وَأَوْصَانِی بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا. وَّ بَرًّاۢ بِوَالِدَتِیْ ۫ وَ لَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا.

”بچہ بول اٹھا: میں اللہ کا بندہ ہوں، اُس نے مجھے کتاب عطا فرمائی اور مجھے نبی بنایا۔ اور جہاں کہیں بھی ہوں، مجھے سرچشمۂ خیر و برکت ٹھیرایا ہے۔ اُس نے مجھے ہدایت فرمائی ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں، نماز اور زکوٰۃ کا اہتمام کروں۔ اور مجھے اپنی ماں کا فرماں بردار بنایا ہے، مجھے سرکش اور بدبخت نہیں بنایا۔

وَ السَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَ یَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا.

(30-35:19)

اور مجھ پر سلامتی (کی بشارت) ہے، جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن مروں گا اور جس دن زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا۔“

امام امین احسن اصلاحی اِس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”جب حضرت مریم علیہا السلام کی آزمایش یہاں تک پہنچ گئی اور وہ ہر مرحلہ میں سو فی صدی کامیاب ثابت ہوئیں تو وقت آ گیا کہ اللہ تعالیٰ اب اپنا اعلان کرا دے کہ وہ اپنے کسی بندے یابندی کے لیے، جو اُس کے امتحان میں کامیاب ہو جائے، اپنی کیا شانیں دکھاتا ہے۔... حضرت مریم علیہا السلام جس امتحان میں ڈال دی گئی تھیں، اُس سے پوری عزت اور سرخ روئی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری تھا کہ گود کا بچہ ہی اُن کی پاک دامنی اور اپنی وجاہت کی شہادت دے تاکہ کسی کے لیے بھی اُس کے بعد لب کشائی کی گنجایش باقی نہ رہے۔“

(تدبر قرآن 4/ 647-648)

[باقی]

نوا کہ چاہے تو پتھر کو جوے آب کرے
غیابِ قدرتِ یزداں کو بے نقاب کرے

خورشید ندیم

یہود اور خدا کا فیصلہ

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحابِ فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

اسرائیل کا ظلم، اُس خوف کا برہنہ اظہار ہے جو روزِ اوّل سے اس کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ بنی اسرائیل کے لیے عالم کے پروردگار کا یہ فیصلہ ہے کہ ذلت و مسکنت تا قیامت ان پر مسلط رہے گی۔

یہود کی تاریخ، خدا کے ساتھ بے وفائی کی ایک طویل داستان ہے۔ ان کا آخری بڑا جرم اپنی ہی قوم سے اٹھنے والے اللہ تعالیٰ کے ایک جلیل القدر رسول سیدنا مسیح علیہ السلام کو اپنے تئیں مصلوب کرنا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اللہ نے ان کو محفوظ رکھا۔ انھی جرائم کی بنا پر انھیں منصبِ امامت سے معزول کرتے ہوئے، ذریتِ ابراہیم کی ایک دوسری شاخ بنی اسماعیل کو اس پر فائز کرتے ہوئے، اس کے ایک عالی مرتبت فرزند، سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو منصبِ رسالت و امامت عطا کر دیا گیا۔ سیدنا عیسیٰ کے انکار اور ان کو مصلوب کرنے کی ناکام کوشش کے بعد، یہود کے بارے میں یہ طے کر دیا گیا کہ وہ قیامت تک بہ طور سزا، حضرت مسیح علیہ اسلام کے ماننے والوں کے رحم و کرم پر رہیں گے۔ (آل عمران 55:3)۔

اسرائیل امریکہ، برطانیہ اور یورپ کی تائید اور نصرت سے قائم ہے۔ یہ سب مسیحی اقوام ہیں۔ برطانیہ نے اس کے قیام میں بنیادی کردار ادا کیا۔ امریکہ نے پھر اس کو گود لے لیا۔ حماس کے حملے کے بعد، اسرائیل نے عام فلسطینیوں کو جس طرح نشانہ بنایا، اس میں اسرائیل کو امریکہ کی مکمل تائید حاصل رہی ہے۔ اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل میں جب حماس کے حملے کی مذمت کے ساتھ اسرائیل کو جنگ بندی کے لیے کہا گیا تاکہ عام متاثرین کو انسانی بنیادوں پر امداد فراہم کی جا سکے تو امریکہ نے اس کو ویٹو کر دیا۔ اپنے جدید ترین طیارہ بردار جنگی جہاز 'جیرالڈ فورڈ' کو اسرائیل کی مدد کے لیے بھیجا۔ اسرائیل کے دفاعی نظام 'آئرن ڈوم' کو مضبوط بنانے کے لیے اسلحے سے لدا ایک اور جہاز بھیجا۔ پہلے وزیر خارجہ اور پھر امریکی صدر اسرائیل کے ساتھ اظہارِ یکجہتی کے لیے پہنچ گئے۔

امریکہ نے جس طرح اسرائیل کی مسلسل حمایت کی، اس کی داستان چشم کشا ہے۔ مارچ میں شائع ہونے والی امریکی کانگریس کی ایک رپورٹ یہ بتاتی ہے کہ 1948ء سے آج تک، امریکہ نے اسرائیل کو 260 ارب ڈالر کی امداد دی، جس میں سے نصف عسکری ہے۔ اقوام متحدہ میں امریکہ نے اسی (80) بار ویٹو کا حق استعمال کیا اور یہ حق، کم و بیش چالیس بار، اسرائیل کے دفاع میں کیا گیا۔

کیا امریکہ یہ سب یہودیوں کی محبت میں کر رہا ہے؟ کیا اسرائیل کی حمایت اس لیے ہے کہ وہ ایک صہیونی ریاست ہے؟ مجھے ان سوالات کے جواب اثبات میں نہیں ملے۔ امریکہ کی یہودیوں سے محبت کی کوئی وجہ دکھائی نہیں دیتی۔ یہودی سیدنا مسیح علیہ السلام کو پیغمبر تو دور کی بات، ایک جائز اولاد نہیں مانتے۔ یہ تو قرآن ہے جس نے دنیا کے سامنے سیدہ مریم علیہا السلام کی پاک دامنی کی شہادت دی۔ یہ اعلان بھی کیا کہ سیدہ کو دنیا کی تمام عورتوں میں سے منتخب کیا گیا اور انھیں سب خواتین پر فضیلت دی گئی ہے۔ (آل عمران 3:42)۔ کوئی ایسا تاریخی سبب بھی موجود نہیں جو اس اتحاد کو سندِ جواز فراہم کر سکے۔

اس کی صرف ایک وجہ سمجھ میں آتی ہے اور وہ ان قوتوں کا مفاد ہے جن کی سلطنتیں بیسویں صدی کے اوائل میں ختم ہو رہی تھیں۔ اُس دور میں زمانے نے جو کروٹ لی، اس میں استعمار کی پرانی صورتوں کا باقی رہنا ممکن نہیں تھا جس کا ایک مظہر 'سلطنت' تھی۔ دنیا بھر میں آزادی کی

تحریکیں اُٹھ رہی تھیں اور قومی ریاستیں وجود میں آ رہی تھیں۔ ان اقوام کو اگر اب دنیا پر اپنا تسلط قائم رکھنا تھا تو اس کے لیے کوئی نئی صورت تلاش کرنا ضروری تھا۔ جنگِ عظیم اوّل کے بعد عالمی قیادت کی دوڑ میں کچھ نئی قوتیں بھی شریک ہو گئیں جن میں ایک امریکہ بھی تھا۔ ان سب نے مل کر دنیا کو 'لیگ آف نیشنز' کا تصور دیا۔

سیاسی تسلط کو قائم رکھنے کے لیے زمین کے مادی وسائل پر قبضہ لازم تھا۔ اُس وقت توانائی کا سب سے اہم ماخذ تیل تھا جس کے سب سے بڑے ذخائر مشرقِ وسطیٰ میں تھے۔ ان پر قبضے کے لیے مشرقِ وسطیٰ کی سیاست پر کنٹرول ضروری تھا۔ اقوامِ متحدہ کے قیام کے بعد دوسرے علاقوں پر طاقت کے زور پر اُس طرح قبضہ ممکن نہیں تھا جس طرح سلطنتوں کے دور میں ہوتا تھا۔ نئی صورت یہ تھی کہ ان خطوں کی سیاست کو اپنے ہاتھ میں لیا جائے۔

مشرقِ وسطیٰ پر اپنا تسلط قائم رکھنے کی سب سے اچھی صورت، یہاں ایک ایسی ریاست کا قیام تھا جو ان اقوام کی نمایندگی اور ان کے مفادات کا تحفظ کرے۔ ہٹلر نے یہودیوں کے ساتھ جو سلوک کیا تھا، اس کو ان اقوام نے جواز بنا کر، بہ ظاہر یہودیوں کی دل جوئی کے لیے ان کی ایک ریاست کا تصور پیش کیا۔ اس کے لیے یہودیوں کے مذہبی جذبات کو استعمال کیا گیا۔ اُن کو بتایا گیا کہ یہ ان کی مذہبی پیش گوئیوں کے پورا ہونے کا وقت ہے اور وہ دوبارہ اپنا مذہبی مرکز حاصل کر سکیں گے۔ یہودیت کی ایک سیاسی تعبیر صہیونیت (Zionism) کے نام سے موجود تھی جس نے دنیا بھر کے یہودیوں کو یہاں جمع کر دیا۔

یہ ریاست قائم ہو گئی، لیکن اس سے یہودیوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ آج بھی بقا کے خوف میں مبتلا ہیں۔ حماس کے وسائل کا اگر اسرائیل کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو ایک اور سو کی نسبت بھی نہیں بنتی۔ اسرائیل کے خوف کا مگر یہ عالم ہے کہ حماس کے مقابلے کے لیے بھی اسے امریکی امداد کی ضرورت ہے۔ آج امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک عربوں کے لیے اسرائیل کو اور اسرائیل کے لیے عربوں کو استعمال کرتے ہیں۔ عربوں کا سارا اسلحہ امریکہ کا دیا ہوا ہے اور اسرائیل تو ہے ہی 'میڈ اِن امریکہ'۔

اسرائیل کی کوئی حیثیت اس کے سوا نہیں کہ وہ مشرقِ وسطیٰ میں امریکی مفادات کا محافظ ہے۔ یہودیوں کے حصے میں کیا آیا؟ ایک مسلسل خوف اور امریکہ پر مستقل انحصار۔ ایک طرف

انھیں یہ خوف لاحق ہے کہ امریکہ میں کوئی ایسی حکومت قائم نہ ہو جائے جو اسرائیل مخالف ہو۔اس لیے وہ امریکہ میں اپنا اثرورسوخ قائم رکھنے کے لیے اربوں ڈالر خرچ کرتے ہیں۔یہ خوف ایسا بے بنیاد بھی نہیں۔جولائی 2022 میں ہونے والے ایک سروے کے مطابق، 60 سے 65 سال کے امریکی اسرائیل کے بارے میں مثبت رائے رکھتے ہیں۔ 18 سے 29 سال کے امریکیوں میں یہ شرح کم ہو کر 41 فیصد رہ گئی ہے۔دوسری طرف یہ احساس کہ وہ چاروں طرف سے عربوں میں گھرے ہیں۔اگر امریکہ نے سرپرستی چھوڑ دی تو وہ جئیں گے کیسے؟

چالیس سال پہلے امریکی سیکرٹری خارجہ الیگزنڈر ہیگ نے کہا تھا: ”اسرائیل امریکہ کا سب سے بڑا طیارہ بردار جنگی جہاز ہے جو ڈوب نہیں سکتا۔اس پر کوئی امریکی سوار نہیں۔یہ ایک ایسے خطے میں موجود ہے جو امریکہ کی قومی سلامتی کے لیے بہت اہم ہے“۔اسرائیل کی سلامتی اگر ہر امریکی انتظامیہ کی ترجیح ہے تو اس کی وجہ یہودی نہیں، امریکہ کے اپنے مفادات ہیں۔

یہ طاقت کا کھیل ہے جس میں یہودی استعمال ہو رہے ہیں۔اس کھیل سے مگر قرآن مجید کی یہ پیش گوئی ایک ناقابلِ تردید حقیقت کے طور پر ثابت ہو رہی ہے کہ بنی اسرائیل خدا کے ساتھ کیے گئے عہد کو توڑنے کے جرم میں، قیامت تک، حضرت مسیح علیہ السلام کے نام لیواؤں کے رحم و کرم پر رہیں گے۔آج وہ ایک طرف خوف میں مبتلا ہیں اور دوسری طرف ساری دنیا کی ملامت کا ہدف۔یہی ان کی سزا ہے۔صدق اللہ العظیم

(بشکریہ روزنامہ دنیا 23-10-22)

ڈاکٹر عرفان شہزاد

جسمانی سزا اور تشدد پسندی کی نفسیات

ہمارے سماج میں تشدد برائے تادیب والدین اور اساتذہ کا جائز حق مانا جاتا ہے۔ اس سے تشدد برائے اصلاح کا جواز پیدا ہوتا ہے۔ تشدد پسندی نفسیات کا حصہ بن جاتی اور مسائل کو بزورِ طاقت حل کرنے کی خُو پیدا ہوتی ہے۔ کسی انتہائی نوعیت کے واقعہ میں معاملے کی سنگینی واضح کرنے کی خاطر کبھی ہلکی پھلکی جسمانی سزا کی ضرورت شاید ہو سکتی ہے۔ شفقت آمیز والدین کی طرف سے اتنی سزا بھی تنبیہ کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔ تشدد کا جواز بہر حال کبھی پیدا نہیں ہوتا۔

بچوں کو نظم و ضبط، اخلاق و آداب اور کچھ ضروری مہارتیں سکھانے کے لیے کچھ سختی کرنا پڑتی ہے، مگر اس کے لیے بھی کسی جسمانی سزا کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تشدد سے اصلاح اندازِ تربیت کی غلطی ہے۔ یہاں اصلاح کی ضرورت اصلاح کار کو ہے۔

برائے تربیت بچوں پر تشدد کرنے کا مذہبی جواز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ایک روایت سے پیش کیا جاتا ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ بچہ دس سال کا ہو جائے تو اسے نماز نہ پڑھنے پر سزا دی جائے۔ یہ روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے۔[1] یہ روایت

1۔ اِس مضمون کی روایت یوں ہے:

عن عمرو بن شعیب، عن أبیه، عن جده، قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم:

”مروا أولادکم بالصلاة وهم أبناء سبع سنین، واضربوهم علیها وهم أبناء عشر سنین، وفرقوا بینهم فی المضاجع“. (سنن ابو داؤد، رقم 495)

"عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تمھاری اولاد سات سال کی ہو جائے تو تم ان کو نماز پڑھنے کا حکم دو، اور جب وہ دس سال کے ہو جائیں تو نماز نہ پڑھنے پر انھیں مارو، اور ان کے سونے کے بستر الگ کر دو۔"

ذخیرۂ حدیث میں یہ روایت صرف دو صحابہ سے منقول ہے:

1۔ سبرہ بن معبد الجہنی رضی اللہ عنہ۔

2۔ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ۔

پہلے صحابی، سبرہ بن معبد الجہنی سے منقول تمام روایات، ایک ضعیف راوی عبد الملک بن الربیع الجہنی کی وجہ سے ضعیف ہیں۔ علماے حدیث اس روایت پر جو حکم لگاتے ہیں، وہ یہ ہے: 'إسناد ضعیف، فیه عبد الملك بن الربیع الجهنی وهو ضعیف الحدیث'۔

دوسرے صحابی عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی نسبت سے منقول روایت منقطع ہے۔ یہ سب سے پہلے "المدونۃ الکبریٰ"، امام مالک میں نقل ہوئی ہے۔(1 / 132) یہ روایت "ابن وھب" بیان کرتے ہیں جن کی پیدایش 125ھ کی ہے، جب کہ جن صحابہ سے وہ نقل کر رہے ہیں، اُن دونوں کا انتقال 65ھ سے پہلے ہو چکا تھا۔ یعنی ان کی ملاقات ثابت نہیں۔ امام مالک نے اِس روایت کے علم میں ہونے کے باوجود خود بھی اسے اپنی "موطا" کا حصہ نہیں بنایا۔

عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے یہ روایت سب سے پہلے حدیث کی جس کتاب میں سامنے آئی، وہ "مصنف ابن ابی شیبہ" ہے۔ ان تمام روایات میں 'سوار بن داؤد' موجود ہیں جن کے بارے میں متعدد علماے جرح و تعدیل مطمئن نہیں ہیں۔ مثلاً حافظ ذہبی نے ان پر "ضعف" کا حکم لگایا ہے۔ اسی طرح "تقریب التہذیب" کے مصنف کی راے میں بھی قابل اعتماد نہیں ہیں۔ ان کے بقول یہ روای ضعیف ہے، مگر اس پر اعتبار کیا جاتا ہے۔ اس کی راے کو سوائے احمد بن حنبل کے کوئی اچھا نہیں سمجھتا۔ 'ضعیف یعتبر به، ولم یحسن الرأی فیه سوی أحمد'۔

لہٰذا تنہا صرف اسی ایک راوی کی بنا پر عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی اس سلسلے کی تمام روایات "ضعیف" قرار دی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بہت سے معاصر علماے حدیث نے بھی اس

روایت کو سنداً قبول نہیں کیا۔

نیز، روایت میں اس کی صراحت نہیں ہے کہ ''عمرو بن شعیب'' اپنے والد کی نسبت سے خود اپنے ہی دادا سے روایت کر رہے ہیں یا اُن کے والد اپنے دادا سے روایت کر رہے ہیں (عن عمرو بن شعیب، عن أبیہ، عن جدہ)۔ پہلی صورت ہے تو روایت میں ارسال ہو گا اور دوسری ہے تو انقطاع ہو گا۔

ابن ابی شیبہ نے اِس پوری بات کو ایک تابعی کے قول کے طور پر الگ سے بھی نقل کیا ہے، جس سے اِس بات کو تقویت ملتی ہے کہ یہ سرے سے حدیث تھی ہی نہیں، بلکہ ایک تابعی کا قول تھا—— چنانچہ ''مصنف'' ہی میں ہے:

حدثنا وکیع، عن سفیان، عن أبی رجاء، عن مکحول، قال: ''یؤمر الصبی بھا إذا بلغ السبع ویضرب علیھا إذا بلغ عشرًا''. (رقم 3402)

''وکیع کہتے ہیں کہ سفیان نے ابی رجا سے اور انھوں نے مکحول سے سنا کہ جب تمھاری اولاد سات سال کی ہو جائے تو تم ان کو نماز پڑھنے کا حکم دو، اور جب وہ دس سال کے ہو جائیں تو نماز نہ پڑھنے پر انھیں مارو۔''

یہ غالباً کسی صحابی کا اثر یا تابعی کی اجتہادی رائے تھی، جو ایسے نقل ہو گئی۔ اِس بات کی تائید ''مسند بزار'' کی ایک اور روایت سے بھی ہوتی ہے۔ امام شوکانی نے اپنی کتاب ''نیل الاوطار'' میں بھی اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا کہ ایک دوسری روایت میں صراحت ہے کہ یہ پوری روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک کاغذ پر لکھی ہوئی ملی تھی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کے بغیر ہی کسی شخص کے الفاظ لکھے تھے کہ اس کے بقول بچے کو نماز نہ پڑھنے پر غالباً نو سال کی عمر میں مارا جا سکتا ہے۔ روایت یہ ہے:

عن عبید اللّٰہ بن أبی رافع، عن أبیہ رضی اللّٰہ عنہ، قال: وجدنا صحیفۃ فی قراب سیف رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بعد وفاتہ فیھا مکتوب: ''بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم، فرقوا بین مضاجع الإخوۃ والاخوات لسبعِ سنین، واضربوا أبناءکم علی الصلاۃ إذا بلغوا أظنہ تسعًا''. (رقم 3332)

''عبید اللہ بن ابی رافع اپنے والد سے بیان کرتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ کی وفات کے بعد

علم و عقل کے مسلّمات اور دین کے مجموعی مزاج سے بھی بظاہر متصادم نظر آتی ہے۔ جب شریعت میں نماز کا مکلف ہی بالغ فرد ہے تو دس سال کی عمر میں نماز ادا نہ کرنے پر مارنا ناقابل فہم ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ نفسیات کے ماہرین بھی یہ بتا سکتے ہیں کہ بچپن کی یہ سختی کیسے انسانوں کے مزاج اور مذہب سے تعلق پر اثر انداز ہوتی ہے، جب کہ دوسری جانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی کریم النفس شخصیت، جنھوں نے پوری زندگی دین کو نرمی، ملائمت اور استدلال سے سمجھایا، وہ کیسے علی الاطلاق ایسی ہدایت کر سکتے ہیں جو جسمانی مار، نفسیاتی دباؤ اور عبادت جیسے شعوری عمل کو زبردستی ادا کرانے کی ترغیب بن جائے۔[2]

تشدد پسندی ہمارے جاگیر دارانہ کلچر میں شامل ہے۔ رعایا کو زیرِ نگیں رکھنے کے لیے ان پر تشدد کے مظاہرے ایک لازمی عنصر کے طور پر اس کلچر کا حصہ چلے آئے ہیں۔ اسی کے مظاہر ہیں جو ہم مختلف صورتوں میں دیکھتے ہیں۔ ہماری علاقائی زبانوں میں موجود محاورے اور ضرب الامثال تشدد پسندی کے جواز کے عکاس ہیں۔ بابا بلھے شاہ سے منسوب یہ اشعار یہی بیان کرتے ہیں:

چار کتاباں اتوں لتھیاں، اتوں لتھا ڈنڈا
چار کتاباں کج نہ کیتا، سب کج کیتا ڈنڈا

(چار الہامی کتابیں اوپر سے نازل ہوئیں اور ڈنڈا بھی اوپر سے نازل ہوا۔ چاروں کتابوں سے

تلوار کے پاس ایک کاغذ لکھا ملا تھا جس پر لکھا تھا: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، بہن بھائیوں کے بستر سات سال کی عمر میں الگ کر دو اور بچوں کو میرے خیال کے مطابق نو سال کی عمر میں نماز ادا نہ کرنے پر مارو۔''

یہی وجہ ہے کہ بخاری اور مسلم تک نے اپنے انتخاب میں اس حدیث کو قبول نہیں کیا۔ (ملخص از تحقیق جناب حسن الیاس، ''بچوں کو نماز نہ پڑھنے پر مارنا'' ماہنامہ اشراق، اگست، 2021۔)

https://www.javedahmedghamidi.info/#!/ishraq/60ffb900404eb9173b50147e?articleId=60ffca6b404eb9173b5014ca&decade=2020&year=2023

[2]۔ ایضاً۔

کچھ نہ ہوا، جو کچھ ہوا ڈنڈے سے ہوا۔)

بچے کو استاد کے حوالے کرتے ہوئے والدین اور سرپرستوں کا یہ کہنا کہ ”بچے کی ہڈیاں ہماری اور گوشت آپ کا“ یعنی بچے کی ہڈیاں نہ ٹوٹیں، باقی کھال پر جتنا چاہیں مشق ستم کیجیے، تشدد کے جواز کا بیانیہ ہے۔ لوگ فخر سے بیان کرتے ہیں کہ بچپن میں انھوں نے والدین اور اساتذہ سے کتنی مار کھائی۔ چنانچہ ہمارے ہاں جسمانی سزائیں آخری چارۂ کار نہیں، بلکہ ترجیحاً اختیار کی جاتی ہیں۔

تشدد سے تربیت پانے والے بچوں میں ڈر، عدم تحفظ، منافقت، جھوٹ، بدیانتی، بزدلی، بدتمیزی اور طاقت کے بل پر مفاد اور مقاصد کے حصول کی خصلتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

سماج اس وقت اگر اخلاقی حالت کی ناقابلِ رشک سطح پر نظر آتا ہے اور تشدد پسندی اور طاقت کے بل پر مسائل حل کرنے کو درست سمجھتا ہے تو اس کے پیچھے تشدد برائے اصلاح کے بیانیے کا گہرا عمل دخل ہے۔ لوگوں کی بڑی تعداد یہ یقین رکھتی ہے کہ ملک میں مثبت تبدیلی لانے کا واحد مؤثر طریقہ یہ ہے کہ کرپٹ سیاست دانوں کو سولی چڑھا کر ملک کو ان سے پاک کر کے تعمیر نو کی بنیادیں رکھی جائیں۔ آمریت کو پسند کرنے والے بھی اسی نفسیات کے حامل ہیں۔ انھیں ملک کے مسائل کا حل ایک مطلق العنان حکمران میں نظر آتا ہے جو اپنے آہنی ہاتھوں سے سب کچھ درست کر دے۔ اپنے مطالبات منوانے کے لیے مختلف گروہوں کا سرکاری اور نجی املاک کی توڑ پھوڑ کرنا، سیاسی انتخابات اور مذہبی اجتماعات کے دوران میں ہونے والے پر تشدد جھگڑے اسی تشدد پسندی کے مظاہر ہیں۔ یہاں تک کہ طب کا شعبہ بھی اس بہیمانہ نفسیات سے محفوظ نہیں۔ ڈاکٹر حضرات ہڑتال کے دوران میں مریضوں کی جانوں کو یرغمال بنا کر اپنی مانگیں پوری کروانا درست سمجھتے ہیں۔ وکلا جتھابندی کر کے مخالفین پر حملے اور تشدد کے جواز پیش کرتے ہیں۔ پولیس زیر حراست ملزمان پر تشدد روا سمجھتی ہے۔ سڑکیں بند کر کے لوگوں کے روزگار، بلکہ بسا اوقات ان کی زندگیوں کو داؤ پر لگا کر اپنے مطالبات منوانا معقول گردانا جاتا ہے۔

فرد اور سماج میں حقیقی تبدیلی کن عوامل کے تحت آتی ہے اور اس میں کتنا وقت لگتا ہے، تشدد پسند ذہنیت اس نفسیاتی اور سماجی سائنس سے نابلد ہوتی ہے۔ جس تبدیلی کا خمیر طاقت کے استعمال اور تخریب پر رکھا جائے اس کے کیا نتائج نکلتے ہیں، تاریخ کے المناک تجربات سے یہ نفسیات واقف

نہیں۔ ڈر اور خوف سے اختیار کی گئی تبدیلی منفی اور ناپائیدار ہوتی ہے۔ تبدیلی وہی دیرپا ہوتی ہے جس کے لیے انسانی شعور کو مخاطب کیا جائے اور اس میں وقت لگتا ہے۔

بچوں کے رویوں میں مثبت کردار پیدا کرنے اور منفی عادات کی روک تھام کے لیے والدین اور اساتذہ کے ذاتی حقیقی کردار اور اچھے ماحول کی دستیابی سے بڑھ کر کوئی چیز موثر نہیں ہوتی۔ بچوں پر تشدد ایک بھیانک عمل ہے جس کے نتائج فرد اور خاندان سمیت پورا سماج بھگتتا ہے۔ بچوں پر تشدد کی روک تھام کے لیے ضروری ہے کہ قانون بھی اس سلسلے میں اپنا موثر کردار ادا کرے۔ اس سلسلے میں کرنے کا پہلا کام خود پولیس کی درست ذہنی تربیت ہے۔

سید عکاشہ

انجیل میں ''ابن اللہ'' کے معنی

امام فراہی رحمہ اللہ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ''خدا کا بیٹا'' نہیں ''خدا کا بندہ'' کہا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

کلّ ما نجد فی الإنجیل من 'ابن اللّٰہ' فھو 'عبد اللّٰہ' فی المعنی وکلّ ما فیہ من 'أبونا' أو 'أبونا وأبوکم'، فھو: ربّنا وربکم. (مفردات القرآن للفراہی 251)	''انجیل میں جہاں کہیں بھی ''اللہ کا بیٹا'' ہے، وہ حقیقی معنی میں ''عبد اللہ'' ہے۔ اور جہاں کہیں بھی ''میرے باپ'' یا ''میرے اور تمھارے باپ'' ہے، اس سے مراد: میرا اور تمھارا پروردگار ہے۔''

امام فراہی رحمہ اللہ زبان کے بہت بڑے ماہر تھے، ان کو عبرانی زبان بھی بخوبی معلوم تھی۔ چونکہ بنی اسرائیل کے مقدس صحائف و کتب بیش تر عبرانی ہی میں ہوتے تھے اور ان کے ربّی اور بڑے پیشوا اسی زبان کو استعمال کرتے تھے۔ آپ کا موقف تھا کہ غالباً اسی زبان میں انجیل کو بھی نشر کیا گیا۔ موجودہ اناجیل بھی صاف صاف الفاظ میں شاہد ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یہودیوں کے مذہبی پیشواؤں سے کثرت سے مکالمے ہوئے جن کے متعلق ایک احتمال ہے کہ عبرانی میں ہوئے ہوں گے۔

پھر عبرانی زبان کے متعلق اپنے استقرا اور کلام کے نظائر سے انھوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عبرانی زبان میں لفظ 'בֵּן' (جس کو عربی میں 'ابن' کہا جاتا ہے)، بندگی کی طرف اشارے کے لیے بھی بہ طورِ تعبیر استعمال ہوتا ہے۔ مگر ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے پاس قدیم عبرانی لٹریچر دستیاب نہیں جس سے اس کے نظائر تلاش کیے جا سکیں، لہٰذا بائیبل ہی سے کچھ

نظائر انھوں نے پیش کیے ہیں جن میں سیاق و سباق اور نظمِ کلام کی روشنی میں کسی صورت 'ابن' سے "بیٹا" مراد نہیں لیا جاسکتا، بلکہ اس کو بندگی کے لیے ایک "تعبیر" سمجھیں تو معنی کھل کر واضح ہوتے ہیں۔ ایک مثال انجیلِ متی سے بھی دی گئی ہے جو لفظ "باپ" کے لیے "رب" کے استعمال پر مضبوط قرینہ ہے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ اولاد کا جو مرتبہ والدین کے مقابلے میں تورات بیان کرتی ہے، اس کے پیشِ نظر یہ بات سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ لفظ 'ابن' کو بہ طورِ تعبیر "بندہ" کے معنی میں بھی استعمال کیا جاسکتا تھا۔ اولاد گویا والدین کے سامنے ایک غلام تھی۔ ماں باپ کی نافرمانی پر آپ قتل بھی ہوسکتے تھے اور ایسا ہی انجام خدا کی نافرمانی کا بھی تھا۔ لفظ اپنی اصل سے نکل کر آہستہ آہستہ دوسرے معنی کی چادر بھی اوڑھ لیتا ہے۔ ممکن ہے کہ عبرانی صحائف پر مزید تدبرانہ طریقے سے نگاہ ڈالنے سے اس لفظ کی حقیقت بہتر طریقے سے متعین ہو۔ امام فراہی نے اپنی ایک کوشش کر رکھی ہے۔

سید منظور الحسن

”نظم قرآن“ پر ایک تنقید کی حقیقت

[”نقد و نظر“ کا یہ کالم مختلف اصحابِ فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

برادرِ عزیز جہانگیر حنیف صاحب نے استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کے تصورِ نظم قرآن پر ایک تاثراتی مضمون تحریر کیا ہے۔[1] یہ اِس موضوع پر جناب احمد جاوید صاحب کی گفتگو کا بر سبیلِ تنزل اعادہ ہے۔ اِس کا مقصد تو استاذِ گرامی کے موقف کا تنقیدی جائزہ ہے، مگر اِس قبیل کا کوئی مواد اِس میں دستیاب نہیں ہے۔ مہمل تبصرے، مبہم مفروضے اور مشتبہ خیالات ہیں، جنھیں یک جا کر کے ”کیا قرآنِ مجید میں نظم پایا جاتا ہے؟“ کے زیرِ عنوان نقل کر دیا ہے۔ تمام تبصرے محض دعوے ہیں، جو اپنے اثبات کے دلائل سے یک سر محروم ہیں۔ ایک دعویٰ بھی ایسا نہیں ہے، جسے کسی دلیل سے مدلل کیا گیا ہو یا کسی ثبوت سے متحقق کیا گیا ہو یا کسی شہادت سے مؤکد کیا گیا ہو۔ چند دعوے ملاحظہ ہوں:

* ”... ان دونوں اصحاب (فراہی و اصلاحی) نے محض نظمِ قرآن کو قرآنِ مجید کی تفسیر کے دوران بطور ایک راہنما اصول کے اختیار کیا، جبکہ غامدی صاحب نے اسے ایک باقاعدہ نظام کی

---

1 ۔ یہ مضمون اُن کے فیس بک پیج پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

شکل دی۔"

یہ ایک اسٹیٹمنٹ ہے، جو اِنھی الفاظ سے شروع ہو کر اِنھی پر ختم ہو جاتی ہے۔ نہ یہ بتایا ہے کہ اِس کا مدعا کیا ہے، اِس کا مصداق کیا ہے۔ نہ یہ واضح کیا ہے کہ فراہی و اصلاحی رحمہا اللہ نے کیسے نظم کو "رہنما اصول" بنایا تھا اور غامدی صاحب نے کیسے اُسے "ایک باقاعدہ نظم" کی شکل دی ہے۔

* "... ایسے شواہد موجود ہیں کہ اگر (غامدی صاحب) کا یہ نظام ان اصحاب (فراہی و اصلاحی) کو ان کے حینِ حیات پیش کیا جاتا، تو وہ اِسے رد کر دیتے۔"

علمِ غیب پر مبنی یہ پر زور دعویٰ تو کر دیا ہے، مگر اُن "موجود شواہد" میں سے کسی ایک شاہد کا بھی ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

* "... نظمِ قرآن سے مراد قرآنِ مجید میں نظم کا عمومی اثبات نہیں۔ بلکہ غامدی صاحب کا پیش کردہ نظمِ قرآن ہے۔ جو اپنی ساخت میں پیچیدہ ترین اور قرآن مجید کی شانِ خطابت سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔"

یہ بھی ایک تاثراتی بیان ہے۔ اصحابِ علم جانتے ہیں کہ اگر اِسے تنقید کے مقام تک پہنچانا ہے تو پہلے یہ بتانا ہو گا کہ "قرآنِ مجید کی شان خطابت" سے آپ کی کیا مراد ہے، پھر اُس شانِ خطابت کو قرآن سے ثابت کرنا ہو گا، پھر یہ بتانا ہو گا کہ "غامدی صاحب کا پیش کردہ نظم قرآن" کیا ہے، پھر اُس کی "ساخت کی پیچیدگی" کے شواہد پیش کرنے ہوں گے اور پھر ثابت شدہ شانِ خطابت اور تحقیق شدہ پیچیدگی کی "عدم مناسبت" کے دلائل دینے ہوں گے۔ اِس کے بعد یہ تاثر اِس لائق ہو گا کہ اِسے تنقید کے زمرے میں شمار کیا جائے۔ اِس کی صحت یا عدم صحت جانچنے کا مرحلہ تو اُس کے بعد آئے گا۔

* """البیان" میں نظم کو انھوں (غامدی صاحب) نے زیادہ تر سے زیادہ اصولی و فقہی مباحث میں برتا ہے۔"

یہ بھی ایک تبصرۂ محض ہے۔ جناب والا، پہلے تو یہ فرمائیے کہ آپ کے نزدیک کون سے مباحث اصولی ہوتے ہیں اور کون سے فقہی ہوتے ہیں، پھر اِس تفریق کو قرآن کی مثالوں سے واضح کیجیے۔ اِس کے بعد بتائیے کہ "البیان" میں کون سے "اصولی و فقہی مباحث" میں نظم کو برتا ہے اور کیسے برتا ہے اور پھر سمجھائیے کہ کون کون سے مباحث بے نظم چھوڑ دیے ہیں۔

* ”... دورِ جدید سے پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے اور ان سے نمٹنے کے لیے قرآن مجید کی ہدایت کو نظم کا موضوع بنایا ہے۔“

یہ بھی ایک خیال ہے، جو ابلاغِ مدعا سے عاری ہے۔ اِس خیال کا ابلاغ مقصود ہے تو بتانا پڑے گا کہ دورِ جدید کے وہ کون سے مسائل ہیں، جن سے نمٹنے کے لیے قرآن کی ہدایت کو نظم کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اِس کے بعد ”البیان“ کے شواہد سے اُس کا اثبات کرنا ہو گا۔

* ”... ان کا تصورِ نظم اپنی نوعیت میں مکینیکل ہے اور قرآن مجید کے معانی کو ایک خاص دائرے تک محدود رکھتا ہے۔“

یہ بھی ایک ہوائی ہے، جو بے بنیاد اڑا دی گئی ہے۔ بھائی پہلے یہ بتائیں کہ آپ مکینیکل نوعیت کس کو کہتے ہیں، پھر اُس مکینیکل نوعیت کا ”البیان“ پر اطلاق کریں، پھر یہ بتائیں کہ قرآنِ مجید میں فلاں فلاں مقامات پر آفاقی مفہوم پایا جاتا ہے، جسے غامدی صاحب نے فلاں خاص دائرے میں محدود کر دیا ہے۔

* ”... یہ بات شاید کہنے کی ضرورت نہیں کہ حکیمانہ تعبیرات آفاقی اور فقہی تعبیرات زمان و مکان میں محصور ہوتی ہیں۔“

یہ بات اگر ”البیان“ سے متعلق ہے تو پہلا سوال یہ ہے کہ قرآن میں ”حکیمانہ تعبیرات“ سے اور اُن کی ”آفاقیت“ سے کیا مراد ہے اور ”فقہی تعبیرات“ اور اُن کے ”زمان و مکان میں محصور ہونے“ کا کیا مطلب ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر ”البیان“ میں قرآن کی حکیمانہ تعبیرات کو فقہی تعبیرات کی صورت دے کر زمان و مکان میں محصور کیا ہے تو مذکورہ تفسیر میں اُس کی چند مثالیں کیا ہیں؟

یہ برادرِ عزیز جہانگیر حنیف صاحب کے چند نمائندہ خیالات ہیں۔ باقی خیالات بھی اِسی طرح دو دو جملوں کے تاثرات پر مبنی ہیں۔ اِن تاثرات پر جو کلماتِ تحسین اُن کے اساتذۂ کرام نے پیش کیے ہیں، وہ بھی حروفِ نیم گفتہ اور تاثراتی اسلوب نگارش کا نمونہ ہیں۔[2]

محترم نادر عقیل انصاری صاحب نے لکھا ہے:

---

2 ۔ انھیں بھی جہانگیر حنیف صاحب کے فیس بک پیج پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

”...اس (تصورِ نظم) میں اور بھی بڑے بڑے مسائل ہیں: مثلاً، نظم کا وجود کلام میں ہوتا ہے یا یہ قاری کے تخلیقی ذہن کی پیداوار ہوتا ہے؟ زیادہ وضاحت سے کہا جائے تو یوں ہے: پہلے کلام کا نظم ایجاد ہوتا ہے اور پھر معنی کا فہم حاصل ہوتا ہے—یا—پہلے فہم حاصل ہوتا ہے اور پھر نظم ایجاد کیا جاتا ہے؟ اول الذکر پر اعتراض یہ ہے کہ اگر فہمِ کلام ہی حاصل نہیں ہوا تو نظمِ کلام کیسے ایجاد ہوا کیونکہ نظمِ کلام تو فہمِ متن کے بعد ہی سمجھ میں آسکتا ہے؟ اور موخر الذکر پر یہ سوال ہے کہ اگر فہمِ کلام، جو اصل مقصود تھا، پہلے ہی حاصل ہو گیا ہے (یعنی نظم کے بغیر) تو اب تلاشِ نظم کی کیا ضرورت باقی رہی؟“

یعنی پہلے ’نظم‘ اور ’کلام‘ میں تفریق قائم کی، پھر ’کلام‘ اور ’مفہوم‘ کو الگ کیا، پھر دائرۂ امکان میں کلام کو مقدم اور مفہوم کو مؤخر اور پھر مفہوم کو مقدم اور کلام کو مؤخر کر کے اعتراضات وارد کر دیے۔ یہ دیکھا ہی نہیں کہ قرآن میں نظم کا موقف رکھنے والے اپنی بات کو کس زاویے سے اور کس تناظر میں بیان کر رہے ہیں اور کیسے نظم کو کلام کا ایسا جزو قرار دیتے ہیں، جو اُس کی پیدایش ہی سے اُس میں سرایت ہوتا ہے[3] اور پھر کیسے اپنی تفاسیر سے اُس کی شہادت پیش کرتے ہیں۔ کیا علمی سوال ایسے اٹھائے جاتے ہیں؟ کیا اعتراض ایسے کیا جاتا ہے؟ کیا تنقید اِس کو کہتے ہیں؟؟؟

برادرِ مکرم طالب محسن صاحب کا ایک تبصرہ بھی اِسی اسلوب کا عکاس ہے۔ فرماتے ہیں:

”...ابھی اس کا موقع نہیں آیا کہ اجزا کا تجزیہ ہو۔ ابھی تو کلام بحیثیت کلام کیا ساخت رکھتا

---

[3]۔ ”نظم کلام کسی کلام کا ایسا جزو لاینفک ہوتا ہے کہ اُس کے بغیر کسی عمدہ کلام کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ قرآن، جس کو فصاحت و بلاغت کا معجزہ قرار دیا جاتا ہے اور جو فی الواقع معجزہ ہے، ایک بہت بڑے گروہ کے نزدیک نظم سے بالکل خالی کتاب ہے۔ اُن کے نزدیک نہ ایک سورہ کا دوسری سورہ سے کوئی ربط و تعلق ہے، نہ ایک سورہ کی مختلف آیات ہی میں باہم کوئی مناسبت و موافقت ہے۔ بس مختلف آیات مختلف سورتوں میں بغیر کسی مناسبت کے جمع کر دی گئی ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایسا فضول خیال ایک ایسی عظیم کتاب کے متعلق لوگوں کے اندر کس طرح جاگزیں ہو گیا ہے، جس کے متعلق دوست دشمن، دونوں ہی کو اعتراف ہے کہ اُس نے دنیا میں ہل چل پیدا کر دی، اذہان و قلوب بدل ڈالے، فکر و عمل کی نئی بنیادیں استوار کیں اور انسانیت کو ایک نیا جلوہ دیا۔“ (تدبر قرآن 1/17)

ہے اس پر کلام ہو گا۔ یعنی سورہ کس نوعیت کی وحدت ہے اور اس کی آیات کے باہمی ربط کی صورتیں کیا ہیں۔ آپ نے جن نقائص کا ذکر کیا ہے۔ وہ ایک وجہ ہیں نظام کے تصور کے ناقدانہ جائزے کی۔ لیکن ممکن ہے وہ نقائص محض نفس نظم کی پروڈکٹ نہ ہوں۔ اس لیے میرا خیال یہ ہے کہ پہلے تصور ہی کی تنقیح اور تشکیل موضوع بننی چاہیے۔''

شاگردِ رشید کے پیش کردہ بے دلیل تبصروں کو پہلے نقائص کہہ کر سندِ تائید سے مشرف کیا ہے اور پھر یہ اشارہ بھی دے دیا ہے کہ اُن کے نزدیک یہ نقائص بعض دیگر اسباب کا نتیجہ ہیں۔ یہ نہایت درجہ کا تاثر تو دے دیا ہے، مگر یہ نہیں فرمایا کہ وہ نقائص کیا ہیں، کیوں ہیں، کہاں پائے جاتے ہیں، کیسے ثابت ہوتے ہیں؟ اِس ضمن میں کوئی مبسوط اور مدلل بات نہ ماضی میں کبھی فرمائی اور نہ اب فرمائی ہے۔

نعیم احمد بلوچ

حیاتِ امین

(سوانح مولانا امین احسن اصلاحی)

(4)

[صاحب تدبر قرآن کی وصیت کے مطابق
ان کے سوانح نگار نعیم احمد بلوچ کے قلم سے]

دوران تعلیم کے واقعات کے ضمن میں امین احسن بیان کرتے ہیں کہ ہم جماعت طلبہ میں وہ سب سے چھوٹی عمر کے تھے، لیکن اس کے باوجود وہ اساتذہ کی توجہ سب طالب علموں سے زیادہ حاصل کر لیتے۔ ان کی اس کامیابی نے بعض بڑی عمر کے طلبہ میں حسد و رشک کے جذبات پیدا کر دیے۔ فطری طور پر ایسے طلبہ ان کی کم زوریوں کی ٹوہ میں رہتے اور جو اساتذہ امین احسن کی ذہانت و مہارت کے زیادہ قائل تھے، ان کے پاس جا کر منفی رائے پھیلاتے۔ بقول مولانا امین احسن: ”وہ میرے خلاف اساتذہ کے کان بھرتے رہتے۔“

اس حوالے سے انھوں نے امین احسن کے بارے میں یہ بات پھیلائی کہ ان کی نحو کم زور ہے۔ اس بات کی بنیاد بھی موجود تھی کیونکہ ابتدائی درجوں میں ان کی قواعد پر گرفت کم زور تھی۔

اس کی ایک وجہ مولانا یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اگرچہ مولانا فراہی کی صرف و نحو پر کتابیں

نصاب کا حصہ بن چکی تھیں، لیکن بعض اساتذہ کے لیے ان کتب کا اسلوب بالکل اجنبی تھا۔ ان کو یہ مولوی لوگ ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔ یوں میرے دو سال برباد ہوئے، جو مولوی اساتذہ مجھے پڑھاتے تھے وہ مجھے آتا نہیں تھا۔ اس طرح کی چیزوں میں مولوی لوگ مجھ سے آگے تھے، لیکن جب عربی عبارت پڑھنے کی بات آتی تو میں ان سب سے آگے ہوتا۔ لیکن عبدالرحمان نگرامی کے آنے کے بعد مدرسے میں ایک انقلاب آچکا تھا۔ نصابی کتب میں بھی تبدیلی آگئی اور جب امام فراہی پوری طرح مدرسے کے امور کے نگران ہوگئے تو مزید اصلاحات ہوئیں، جن کا امین احسن کو بہت فائدہ ہوا۔

ان کے یہ ہم جماعت شاید اس بات سے پوری طرح آشنا نہ تھے کہ امین احسن اپنی اس کم زوری کو دور کر چکے ہیں اور ان کے پسندیدہ استاد مولانا عبدالرحمان نگرامی کی رہنمائی میں اب ان کے اندر اس طرح کی کوئی کمی کجی باقی نہیں رہ گئی۔ (اس سلسلے میں ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ ایک فارسی کتاب کے ذریعے سے امین احسن سارے قواعد سیکھ اور سمجھ چکے تھے۔)

امین احسن بتاتے ہیں کہ یہ بات ان کے حاسدین نے اس شد و مد سے پھیلائی کہ اس کی بِھنک امام فراہی تک جا پہنچی۔ امام فراہی اگرچہ اس وقت امین احسن کے براہ راست استاد نہیں تھے، لیکن ان کی نظر اس لائق شاگرد پر ضرور تھی۔

یاد رہے کہ ابتدائی درجوں میں مولانا فراہی طلبہ کو خود نہیں پڑھاتے تھے۔ ان کی تدریس اساتذہ کے لیے خاص تھی۔ البتہ امین احسن ان کے لیے پہلے دن ہی سے کوئی اجنبی طالب علم نہیں تھے۔ وہ تو اس دن سے انھیں جانتے تھے جب ان کے والد ہاتھی پر بیٹھ کر مدرسۃ الاصلاح میں ان سے ملنے بطور خاص آئے تھے اور انھوں نے اپنے بیٹے کا مولانا فراہی سے تعارف کرایا تھا اور یقیناً ان کا خاص خیال رکھنے کو کہا ہو گا۔ کیونکہ امین احسن علاقے کے معلوم و معروف اور مُتموَّل زمین دار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اس زمانے میں ہاتھی پر سوار ہو کر کسی خاص جگہ پر جانا ایسے ہی تھا جیسے آج کے زمانے میں کسی قیمتی اور بڑی گاڑی پر سوار ہو کر جانا۔

امین احسن جیسے ہونہار طالب علم کے بارے میں یہ اطلاع ان کے لیے یقیناً تشویش کا باعث تھی کہ انھیں نَحو جیسی بنیادی اور بہت ضروری مہارت میں مسائل ہیں۔ اس کے بعد جو واقعہ ہوا اس سے متبادِر ہے کہ امین احسن اس سے واقف نہیں تھے کہ ان کے بارے میں اس طرح کی

کوئی بات صدر مدرسہ اور سب کی نظروں کے محور استاذ الاساتذہ امام حمید الدین فراہی تک پہنچ چکی ہے۔ اور وہ اس سے بھی ناواقف تھے کہ امام فراہی ان کا ایک بے رحم امتحان لینے والے ہیں۔ دراصل امام فراہی کو یہ بالکل گوارا نہیں تھا کہ ان کے مدرسے کا کوئی طالب علم فنی طور پر کم زور ہو۔ اور یہ طالب علم تو ویسے بھی خاص طالب علم تھا۔ اس لیے انھوں نے اس خبر کو متحقق کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

امین احسن کا کڑا امتحان

اس واقعے کا زمانہ تو مولانا امین احسن نے نہیں بتایا، لیکن قرائن سے لگتا ہے کہ کم از کم یہ پانچویں یا چھٹے درجے کے بعد کی بات ہو گی۔ اور یہ وہ دور تھا جب امام فراہی مدرسے کے تمام اساتذہ اور طلبہ کے لیے درس قرآن دیتے تھے۔ اسی لیے یہ درس بہت اہمیت کا حامل ہوتا تھا۔ اس میں امام فراہی اس طریقے سے قرآن کی تدریس کرتے تھے جو ان کا خاص میدان تحقیق تھا۔ درس کی اس اہمیت کے باوصف اس میں حاضرین کی تعداد یقیناً زیادہ سے زیادہ رہتی ہو گی۔

امین احسن بتاتے ہیں کہ ایک دن جیسے ہی درس کی مجلس تیار ہوئی، میں بھی آ کر بیٹھ گیا۔ مگر درس کے باقاعدہ آغاز سے پہلے ہی انھوں نے ایک دم مجھے مخاطب کیا اور پوچھا: ''امین، ''لِ'' کیا صیغہ ہے؟''

ظاہر ہے امین احسن کے لیے یہ ایک غیر متوقع صورت حال تھی۔ اس لیے پہلے تو انھوں نے اسے سنجیدہ نہیں لیا۔ اپنے اس تاثر کو بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

> ''میں سمجھا کہ ''لا'' کی جگہ ''لِ'' کہہ دیا ہے، شاید مذاق میں ہیں۔ لیکن غور کیا کہ وہ تو ''لِ'' کہہ رہے ہیں۔ میں نے توقف کیا اور (لمحوں میں) اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ یہ ''وَلِیَ'' میں ''ع'' کلمہ ہے، اور امر کی وجہ سے ''لِ'' رہ گیا ہے۔ یہ نتیجہ نکال کر میں نے کہا: ''یہ امر کا صیغہ ہے۔''

مگر امام فراہی آج امین احسن کی قابلیت واضح کرنے کا ارادہ کر چکے تھے۔ انھوں نے تُرت پوچھا: ''کس وزن پر؟''

میں نے کہا: ''قِ'' کے وزن پر۔

امین احسن کا مطلب تھا جیسے ''وَقِ'' میں ''قِ'' ہے۔ (وَقِنَا عَذَابَ النَّار میں)

امتحان جاری رہا اور امام نے اگلا سوال داغا: ''کیا معنی ہیں؟''

امین احسن نے لفظ کے معروف معنی بتائے کہ ''والی ہونا''۔

استاذ الاساتذہ نے مزید پوچھا: ''کیا یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں؟''

انھوں نے دوسرے معنی ''مدد کرنا'' کے بارے میں پوچھا۔

امین احسن نے کہا: ''ہاں یہ بھی ہو سکتے ہیں۔''

تب انھوں نے پورے حاضرین کو متوجہ کیا اور قدرے سپاٹ لہجے میں کہا: ''کون کہتا ہے کہ تمھیں نحو نہیں آتی؟''

مولانا بتاتے ہیں کہ میرے دل میں آیا کہ یہ کہہ دوں کہ یہ لوگ، اور یہ لوگ۔ لیکن پھر سوچا کہ اب تو میں نے فتح حاصل کر لی ہے۔ اب اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

یہ واقعہ مولانا نے کئی دفعہ بیان کیا۔ لیکن ایک دفعہ بھی، حتیٰ کہ پوچھنے کے باوجود انھوں نے کسی بھی ہم جماعت کا نام نہیں لیا۔ اس سے ان کے علم اور تربیت، دونوں کا ادراک ہوتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس امتحان میں کامیابی ان کے لیے بہت معنی رکھتی تھی۔

عربی زبان کے طالب علم ذرا غور کریں کہ ان کو یکایک ایک مشکل فعل، جس میں دو حروف عِلّت ہوں، کے حوالے سے یہ سوال کیا جائے تو کیا وہ ان سارے سوالوں کا جواب دے سکتے ہیں جن کا جواب امین احسن نے بھرپور اعتماد اور پوری کامیابی سے دیا؟

اس امتحان میں سرخروئی بلاشبہ نوجوان طالب علم امین احسن کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ مولانا بتاتے ہیں کہ اس کے بعد کسی میں جرأت نہ ہوئی کہ مجھے اس حوالے سے مُتَّہم کرے۔

قصہ عربی شاعری کا

امین احسن کے انھی ''کرم فرماؤں'' نے مولانا فراہی تک یہ خبر بھی پہنچائی کہ امین احسن عربی شاعری کے بارے میں عجیب عجیب تبصرے کرتے ہیں۔ کہتے ہیں عربی شاعری بھی کوئی شاعری ہے! کچھ پتا نہیں چلتا کہ شاعر محبوبہ کی تعریف کر رہا ہے کہ اونٹنی کی!

مولانا بتاتے ہیں کہ اس ''شکایت'' کا شان نزول یہ تھا کہ استاد نے سبع معلقات کا پہلا قصیدہ پڑھایا۔ اور میں نے اس پر متذکرہ تبصرہ کر دیا۔

یاد رہے کہ سَبَع مُعَلَّقات یعنی سات لٹکائے گئے قصیدے، عربی زبان کے سات عظیم شعرا کا کلام ہے۔ زمانۂ جہالت میں عرب میں رواج تھا کہ مختلف میلوں یا تقاریب میں شعرا اپنا کلام سناتے۔ ان میں جو کلام بہت زیادہ پسند کیا جاتا، اس کی عزت افزائی کے لیے اسے لکھا جاتا اور پھر کعبہ کی دیواروں پر لٹکا دیا جاتا۔ یہ مجموعۂ کلام ان سات کلاسیکی شعرا کا کلام ہے جنھیں کعبہ کی دیواروں پر لٹکایا گیا تھا۔ کلاسیکی عربی کی مہارت کے لیے اسے عام طور پر نصاب میں شامل کیا جاتا ہے۔ یہ مجموعہ مدرسۃ الاصلاح کے نصاب کا بھی حصہ ہے۔ اس کا پہلا قصیدہ مشہور جاہلی شاعر اِمرَؤالقَیس کا ہے۔ اور اس قصیدے کا پہلا شعر یہ ہے:

قِفَا نَبْكِ مِنْ ذِكْرَى حَبِيبٍ وَمَنْزِلِ
بِسِقْطِ اللِّوَى بَيْنَ الدَّخُولِ فَحَوْمَلِ

اس شعر کا اردو ترجمہ ہے:

"اے دو دوستو، ذرا ٹھہرو تاکہ ہم محبوبہ اور (اُس کے اِس) گھر کی یاد تازہ کر کے رولیں جو ریت کے ٹیلے کے آخر پر مقامات دخول اور حومل..."

اس قصیدے کے لفظی اردو ترجمے کی وجہ سے امین احسن نے مذکورہ تبصرہ کر دیا۔

یہ بات امام فراہی تک پہنچی تو انھوں نے فرمایا کہ انھیں شاعری پڑھائی ہی نہیں گئی۔ چنانچہ جب امین احسن سے ان کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے بڑی محبت سے انھیں بلایا اور پوچھا کہ بھئی آپ نے عربی شاعری کے بارے میں کیا کہا ہے؟

امین احسن نے وہی بات دہرائی۔ تب استاذ نے کہا کہ کوئی شعر پڑھو۔ انھوں نے وہی پہلا شعر پڑھا اور وہی ترجمہ کیا جو ہم نے اوپر درج کیا ہے۔ امام فراہی بولے:

"نہیں، اس کا ترجمہ یوں کریں: ٹھیرو، ٹھیرو، دوستو، جاناں اور منزل جاناں پر دو آنسو بہانے دو..."

مولانا بتاتے ہیں کہ میں نے انھیں شعر کا پورا ترجمہ بھی نہیں کرنے دیا اور پکار اٹھا: "لاریب، شعر ہو گیا۔ اب یہ شعر ہو گیا ہے۔"

اس کے بعد انھیں کبھی یہ شکایت نہ ہوئی، بلکہ ان کا کہنا ہے کہ مجھے اردو اور فارسی کے مقابلے میں عربی شاعری زیادہ پسند آنے لگی۔

اردو کے پیدایشی عالم

اردو کے حوالے سے انھوں نے بتایا کہ میرا داخلہ اگرچہ اردو میڈیم میں ہوا تھا اور نصاب میں اردو کی کچھ چیزیں شامل تھیں، لیکن اساتذہ نے فرمان جاری کیا کہ امین احسن کو اردو پڑھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ یہ پہلے ہی پڑھے پڑھائے ہیں۔

مولانا ابتدائی درجوں کے بعد اپنی تیز رفتار تعلیمی ترقی اور بہتر استعداد ہونے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کرتے ہیں:

> ”میں نے شعور آنے کے بعد سیکھا ہے۔ آدمی جو چیزیں بڑے ہو کر سیکھتا ہے، وہ بہت تیزی سے سیکھتا ہے اور زیادہ توجہ اور گہرائی سے سیکھتا ہے۔ اس سے وہ برسوں کی جست لگاتا ہے۔ اور میں نے بھی یہ جست لگائی۔“

چنانچہ مولانا بچوں کو بہت چھوٹی عمر میں مدرسے داخل کرانے کے خلاف تھے۔ ان کی رائے کے مطابق جب تک بچے کا شعور پختہ نہ ہو جائے، اسے باقاعدہ تعلیم کے لیے سے مدرسے میں بھیجنا درست حکمت عملی نہیں ہے۔

فارسی کے سخت استاد

اردو کی تدریس سے امین احسن کو مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ بقول مولانا: انھوں نے مجھے اردو کا پیدایشی عالم قرار دے دیا۔ لیکن فارسی انھیں پڑھنا پڑی اور اس کا قصہ بھی دل چسپ ہے۔ اس کا بیان ہم انھی کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں:

> ”فارسی کا ایک گھنٹا رکھا گیا۔ اس سے مجھے فائدہ پہنچا۔ اس کے استاد بڑے ’عَبُوساً قَمْطَرِیْرا‘ قسم کے تھے۔ الامان الحفیظ۔ لیکن بہر حال فارسی میں نے ان سے پڑھی۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ انھوں نے حساب کتاب بھی سکھایا۔ جمع، تفریق، ضرب، تقسیم۔ مگر یہ چیز نہ مجھے آئی، نہ اب آتی ہے اور نہ کبھی آسکتی ہے۔ یہ میری فطرت کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہمیں خوش نویسی اور خطاطی بھی سکھائی۔ لیکن اس میں بھی ہم ان کو چکمہ دے دیتے۔ مجال ہے جو کبھی ایک صفحہ بھی لکھ کر دیا ہو... بالکل نہیں۔ لیکن فارسی ان سے ضرور پڑھی اور خوب پڑھی۔“

اصل میں مولانا کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے فارسی کے استاد بہت سخت مزاج کے تھے۔ انھوں نے ان کی سخت مزاجی کے لیے قرآن کی سورہ 'اَلدَّھْر' کی آیت دس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آیت اور اس کا ترجمہ یہ ہے:

اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا یَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا۔

''ہم اپنے پروردگار کی طرف سے اُس دن کا اندیشہ رکھتے ہیں جو نہایت روکھا ہے، بڑا ہی ترش رو ہے۔''

بیان کیا جاتا ہے کہ ان سے کوئی طالب علم جسمانی سزا سے نہیں بچا، لیکن امین احسن واحد طالب علم تھے جو ان سے محفوظ رہے۔ نہ صرف محفوظ، بلکہ انھوں نے کوئی ایسی ترکیب لڑائی کہ سوائے فارسی کے ان سے باقی چیزیں پڑھی ہی نہیں۔ اب یہ ترکیب کیا تھی، اس کا انھوں نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سے بھی انھوں نے اردو کی طرح استثنا لے لیا ہو گا، کیونکہ مولانا کا خط اچھا تھا۔ مگر مولانا بتاتے ہیں کہ اس تعلیم کے لیے بھی علیحدہ سے ایک گھنٹا مقرر تھا۔ اب ایک سخت گیر استاد کے سامنے یہ وقت وہ کس سرگرمی میں گزارتے، یہ یقیناً ایک دل چسپ راز ہے۔

امین احسن کی پہلی تقریر

زمانۂ طالب علمی کا ایک اہم واقعہ امین احسن کی پہلی پبلک تقریر ہے۔ یہ تقریر انھوں نے مدرسۃ الاصلاح کے پہلے سالانہ جلسے میں کی تھی۔ اس وقت وہ چھٹے درجے کے طالب علم تھے۔ اور جلسے میں مدرسے میں آٹھ برس مکمل کرنے والے پہلے بیچ کو اسناد دی جانی تھیں۔ جلسے کی صدارت کے لیے مولانا محمد علی جوہر کو خصوصی دعوت دی گئی تھی۔ مولانا نے اس تقریب کا ذکر ماہنامہ ''میثاق'' جولائی 1964 کے شمارے میں کیا ہے۔ اس میں مولانا نے ''مولانا محمد علی مدرسۃ الاصلاح میں'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے محمد علی جوہر، امام حمید الدین فراہی اور مولانا محمد قاسم کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

''اگرچہ بڑوں کے اس ذکر کے درمیان اپنا بیان کچھ مناسب نہیں، لیکن جن کا کل سرمایۂ زندگی صرف وہ چند چھوٹی بڑی نسبتیں ہی ہوں جو بڑوں سے ان کو حاصل ہوئیں، وہ اگر ان کو بیان نہ

کریں تو آخر اپنے طرۂ افتخار کی آرایش کے لیے سامان کہاں سے لائیں گے! اس وجہ سے مجھے یہ واقعہ ذکر کرنے کی اجازت دیجیے کہ یہی جلسہ، جس کا اوپر ذکر ہوا، اول اول مجھے پبلک میں روشناس کرانے کا ذریعہ بنا۔ وہ اس طرح کہ مجھے مدرسہ کی تعلیم و تربیت کا نمونہ دکھانے کے لیے مدرسہ کے ذمہ داروں کی طرف سے اس جلسہ میں ایک تقریر کرنے کی ہدایت کی گئی۔ چنانچہ میں نے اس میں ایک تقریر کی۔ یہ تقریر میری اپنی ہی تیار کردہ تھی اور اگرچہ کسی پبلک جلسہ میں یہ میری بالکل پہلی تقریر تھی، لیکن میری عمر اور علم کے اعتبار سے نہایت کامیاب رہی۔ مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ اور اسٹیج پر بیٹھے ہوئے دوسرے اکابر نے اس کی بڑی تحسین فرمائی۔ یہاں تک کہ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے بَصِلۂ حُسنِ تقریر پر اپنے تفسیری رسائل کا ایک سیٹ اپنے دستخط سے مزین فرما کر مجھے بطور انعام عنایت فرمایا۔ اس کے بعد مجھے دور دور سے جلسوں کی شرکت کے لیے دعوت نامے ملنے لگے۔ اور میں کبھی کبھی جلسوں میں شریک بھی ہونے لگا۔ لیکن میں نے یہ 'لَے' بڑھنے نہیں دی، اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے استاذ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ زیادہ تقریریں کرنے کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ تو انھوں نے مجھ سے یہاں تک فرمایا کہ زیادہ تقریریں کرنے سے آدمی کا دل سیاہ ہو جایا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس چیز کو وہ اس درجہ ناپسند فرماتے ہوں، اس کی طرف زیادہ راغب ہونا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔"(46)

اس واقعے کو مولانا بہت زیادہ اہمیت کیوں دیتے ہیں؟ اس کا اندازہ اس تفصیل سے ہوتا ہے جو انھوں نے زبانی روایت میں بیان کی:

"میری پہلی تقریر پر مولانا (فراہی) نے بطور خاص تبصرہ کیا۔ (جلسے کے بعد) لوگ کھڑے ہوئے تبصرے کر رہے تھے تو مولانا (فراہی) نے کہا کہ اس طالب علم کی تقریر بھی بہت اچھی تھی۔ انھوں نے مولانا محمد علی کی تقریر کا ذکر نہیں کیا، سید سلیمان ندوی کی تقریر کا ذکر نہیں کیا، مولانا عبدالرحمان نگرامی، جو وقت کے عبقری تھے، کیا کہنے ان کی تقریر کے، اس تقریر کا بھی ذکر نہیں کیا۔ انھوں نے میری تقریر پسند کی۔ مولانا نگرامی نے آگے بڑھ کر کہا کہ مولانا، اس طالب علم کے پاس آپ کی کوئی یادگار ہونی چاہیے۔ انھوں نے پوچھا: کیا؟ پھر کچھ سوچ کر اپنے تفسیری مجموعے جو کہ عربی میں تھا، اس کا سیٹ عنایت کیا اور اس پر میرا نام لکھا

اور دستخط کیے۔‘‘

جیسا کہ مولانا نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ انھوں نے استاد کی تنبیہ پر زیادہ تقریریں نہیں کیں، لیکن امام فراہی کو ان کی اتنی تقریریں بھی زیادہ لگیں۔ چنانچہ کسی اور موقع پر امین احسن کی کی گئی تقریر کی انھوں نے جہاں تحسین کی، وہاں یہ بھی فرمادیا: ’’ہاں بھئی، یہ بڑے ابو الکلام آزاد ہیں۔‘‘

اس جملے کو امین احسن نے کن معنوں میں لیا، اس کی روایت استاد محترم جناب جاوید احمد صاحب غامدی نے ان الفاظ میں کی:

’’انھوں نے لفظ ’آزاد‘ اس طرح ادا کیا کہ ان کی یہ تعریف میرے لیے تعریف کم اور تنبیہ زیادہ ہوگئی۔ میرے استاد کی تربیت کا یہی انداز تھا۔‘‘ (اشراق جنوری / فروری 1998، 15)

یہاں اس امر کا جائزہ لینا مناسب معلوم ہو گا کہ امین احسن نے یہ تقریریں کس موضوع پر کی تھیں؟

مولانا نے خود تو اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی، لیکن یہ یقینی بات ہے کہ انھوں نے یہ تقریریں تحریک خلافت (1919-1922) کے درمیان میں کسی وقت کی ہوں گی۔

تحریک خلافت برصغیر کی سب سے مقبول اور ہندو مسلم اتحاد میں چلنے والی سب سے بڑی تحریک تھی۔ اس کا آغاز اس وقت ہوا جب جنگ عظیم اوّل (1914-1918) میں جرمنی کی اتحادی فوجوں کو برطانوی اتحاد نے شکست دے دی۔ جرمنی کا سب سے طاقت ور اور بڑا اتحادی ترکی تھا۔ یہ ترکی اس وقت خلافت عثمانیہ Ottoman Empire (1517-1924) کہلاتا تھا اور اس میں تین براعظموں کے علاقے شامل رہے تھے اور اس وقت بھی جنوب مشرقی یورپ، مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ کا زیادہ تر حصہ شامل تھا۔ موجودہ جغرافیے کے مطابق تقریباً 47 ممالک اس میں شامل رہے۔ یہ مسلمانوں کی سیاسی سطوت کی علامت تھی۔ یعنی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے خلافت کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا، یہ اسی کا تسلسل سمجھا جاتا تھا اور مسلمانوں کو اس سے بڑی مذہبی وابستگی تھی۔ جب اس جنگ میں ترکی کو شکست ہوگئی تو برصغیر کے مسلمانوں کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ کیا خلافت کا یہ تسلسل ختم ہو جائے گا؟ اور اس کے زیر تسلط عرب اور بالخصوص مکہ و مدینہ کا مستقبل کیا ہو گا؟ چنانچہ برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے تئیں

خلافت کے ادارے کو بچانے اور حجاز کے علاقے کو محفوظ کرنے کے لیے اس تحریک کا آغاز کیا۔ اب ہندستان میں تو انگریزوں یعنی برطانیہ کی حکومت تھی۔ اس لیے یہاں کے مسلمانوں نے اپنی حکومت ہند سے یہ مطالبہ کر دیا کہ اتحادی خلافت کے خاتمے اور حجاز پر قبضہ کرنے سے باز رہیں۔

اس وقت ساری مسلم قیادت اس تحریک کے ساتھ تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد، شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مفتی کفایت اللہ، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا احمد حسین مدنی، مولانا محمد سجاد بہاری، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سلامت اللہ فرنگی محلی، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا سید محمد ناصر الہٰ بادی، مولانا سید داؤد غزنوی، مولانا آزاد سبحانی، مولانا عبدالرحمان لدھیانوی، ڈاکٹر مختار انصاری، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مسٹر مظہر الحق، عطا اللہ شاہ بخاری اور ظفر علی خاں وغیرہ۔ یعنی مذہبی و سیاسی قیادت کے چند ناموں (مثلاً بانی پاکستان محمد علی جناح) کو چھوڑ کر سبھی لوگ۔ نہ صرف مسلمان، بلکہ مہاتما گاندھی سمیت تمام ہندو اور سکھ رہنما بھی پورے جوش و جذبے سے اس میں شامل تھے۔ ایک وقت ایسا آیا کہ نمایاں مسلم قیادت کی گرفتاری کے بعد اس تحریک کی قیادت مہاتما گاندھی نے کی۔

یہ تحریک اس وقت ختم ہو گئی جب 1922ء میں خود ترکوں نے مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں خلافت کا خاتمہ کر دیا اور ہندستان میں چوری چورا کے حادثے میں متعدد ہلاکتوں کے بعد گاندھی نے بھی باضابطہ طور پر تحریک کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

یہ بھی معلوم ہے کہ دبستان شبلی کے سارے بزرگ تحریک خلافت کے پرزور حامی تھے۔ اس کی تصدیق مولانا محمد علی جوہر کی اس جلسے میں آمد سے بھی ہوتی ہے جس میں امین احسن نے پہلی تقریر کی تھی۔ اس لیے درایتاً یہی معلوم ہوتا ہے کہ امین احسن اسی موضوع پر تقریر کرتے ہوں گے۔ چنانچہ ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ امین احسن کی یہ تقریریں ترکوں اور خلافت کی حمایت میں ہوں گی۔

مدرسۃ الاصلاح کا ماحول

تعلیمی ماحول کے بعد ضروری ہے کہ ہم مدرسۃ الاصلاح کی بود و باش کی بھی ایک تصویر پیش کریں۔ اس سے معلوم ہو گا کہ مدرسے کا ماحول کیا تھا۔ اس نے مولانا کی کیا معاشرتی تربیت کی؟

یاد رہے کہ مدرسۃ الاصلاح ایک اقامتی مدرسہ تھا۔ مدرسے کا ایک یونیفارم تھا اور ایک ہی طرح کا سب کا کھانا پینا اور بود و باش تھی۔ اساتذہ بھی وہیں رہایش پذیر ہوتے تھے۔ کھانے پینے کی بات کی جائے تو یہ اس وقت کے عام آدمی کی طرح کا تھا۔ مدرسے کے ایک طالب علم اور امام فراہی کے سوانح نگار ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، جو خود بھی مدرسۃ الاصلاح ہی کے فارغ التحصیل ہیں، لکھتے ہیں:

”غذا کی سادگی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ شروع کے تیس چالیس سال فی کس خوراک تین سے چار روپے ماہانہ رہی۔ 1979ء میں کھانے کا خرچ ساٹھ روپے فی کس ماہوار تھا۔ کھانے کا معیار ہمیشہ ایک رہا۔ بقول مولانا امین احسن اصلاحی، دال روٹی غریبوں کا کھانا ہے۔ یہی دال روٹی یہاں کے طلبہ کی اصل خوراک ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ ہفتے میں دو بار چٹنی کی جگہ گوشت سے منہ کا مزا بدل لیتے ہیں۔“

”قمیض یا کرتے کے ساتھ پاجامہ ہر موسم کا لباس ہے۔ کھپریل کے مکانوں میں رہتے ہیں، اپنے کمروں کی صفائی خود کرتے ہیں، کپڑے اپنے ہاتھ سے دھوتے ہیں، لیکن استری کیے بغیر نہیں پہنتے اور استری بھی اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں۔ مشہور صحافی اور مصنف نصر اللہ خان عزیز نے ایک بار مدرسے کو دیکھا تو انھوں نے طلبہ میں صفائی کی کمی کی شکایت کی۔ مجھے ان کی یہ نکتہ چینی پڑھ کر حیرت ہوئی۔ سادگی کے ساتھ صفائی مدرسے کے طلبہ کا ایک نمایاں وصفِ امتیازی ہے۔ نصر اللہ خان عزیز میرے زمانۂ طالب علمی میں گئے تھے اور میں اس وقت کے حالات کا عینی شاہد اور شریکِ واقعہ ہوں۔ انھوں نے شاید یہ خیال نہ رکھا ہو کہ یہ ایک غریب ضلع کے دیہات سے آئے ہوئے طالب علم ہیں جو ایک دینی مدرسے میں پڑھتے ہیں...“

”نصر اللہ خان عزیز کی اس رائے کی تردید انھی کے رفیقِ سفر مولانا مسعود عالم ندوی کے اظہار سے ہو جاتی ہے جس میں انھوں نے مدرسے کے طلبہ میں صفائی پسندی کا ذکر کیا ہے۔ میں یہاں ان کے الفاظ نقل کرتا ہوں:

”سادگی اور ستھرا پن کے متعلق سنا کرتے تھے۔ حرف بحرف صحیح پایا۔“

”دونوں ساتھ مدرسے گئے اور ایک ہی تاریخ میں اپنی رائے لکھی ہے۔“

لباس کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

”سر پر کپڑے کی ٹوپی اور پاؤں میں آج کل کے ہوائی چپل اور میرے زمانے میں کھٹ پٹی پہنتے تھے۔ کھٹ پٹی کا رواج ختم ہو گیا۔ یہ لکڑی اور موٹے نواڑ کی پٹی کا مرکب آج کل کے ہوائی چپل کا سستا بدل تھی۔ یہ کھڑاؤں سے مختلف تھی۔ نصر اللہ خان عزیز جب مدرسے گئے تو نماز میں ایک جگہ اکٹھی سینکڑوں کھٹ پٹیاں دیکھ کر کچھ متعجب ہوئے۔ ان کے ذہن میں یہ الجھن پیدا ہوئی کہ رات میں نمازوں میں تاریکی کے اندر ایک جیسی کھٹ پٹیوں میں لڑکے اپنی کھٹ پٹی کس طرح پہچانتے ہیں ؟ غالباً انھوں نے کسی سے اس کا اظہار بھی کیا اور اس نے وضاحت بھی کی، جس پر خان صاحب کی رگِ ظرافت پھڑکی اور انھوں نے مزاحاً کہا کہ یہاں کے لڑکوں کے پاؤں میں عقل ہوتی ہے؟ اس پر مولانا اصلاحی نے کہا نہیں، بلکہ ان کے پاؤں میں ’بھی‘ عقل ہوتی ہے۔“(ذکر فراہی 404-403)

عام طور پر دینی مدرسوں میں سونے کے لیے زمینی بستر ہی کا رواج ہے۔ اور مدرسۃ الاصلاح کے دور میں شاید ہی کسی ایسے دینی مدرسے کی نشان دہی کی جاسکتی ہو جہاں پر طلبہ کو چارپائی پر سونے کی سہولت دستیاب ہو۔ البتہ مدرسۃ الاصلاح میں اساتذہ اور طلبہ، دونوں کے لیے چارپائیوں کا انتظام ہوتا تھا۔ اگرچہ علامہ شبلی نعمانی اسی بات کو پسند کرتے تھے کہ طلبہ زمین پر سوئیں، لیکن ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی بیان کرتے ہیں کہ مدرسۃ الاصلاح میں طلبہ زمین کے بجاے چارپائیوں پر سوتے تھے۔(ذکر فراہی 404)

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی (2011-1934) سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ مولانا اصلاحی سے ملنے لاہور آئے۔ مجھے یاد ہے کہ وہ بہت سادہ لباس میں تھے۔ صاف نظر آرہا تھا کہ مدرسۃ الاصلاح میں سیکھی گئی سادگی ان کی شخصیت کا حصہ بن چکی ہے۔ اور بود و باش میں یہی سادگی ہمیں مولانا امین احسن میں بھی نظر آتی تھی۔ اس موضوع پر حالات زندگی مکمل کرنے کے بعد ہم علیحدہ سے ایک باب قائم کریں گے۔

[باقی]

خیال و خامہ

جاوید احمد غامدی

مے خانہ

میں دیکھتا ہوں فضا ہاے احمریں کی نمود
یہ وقتِ شام ہے اِس کو بروضِ گل کہیے
عجب نہیں کہ میسر ہوئی ہے اِس کے طفیل
متاعِ ذوقِ تماشا مرے جنوں کے لیے

بہ پاسِ خاطرِ احباب سوے مے خانہ
نکل پڑا ہوں تو جوشِ قدح ہوا ہے سوا
ہر ایک تارِ ربابِ نظر پکار اٹھا
مرے ورود پہ آئی سبو سبو سے صدا

ترا وجود قیامت ہے بزمِ مے کے لیے
رہی ہے تیرہ شبوں میں تجھے سحر کی تلاش

سنی یہ بات تو ساقی نے مجھ سے فرمایا
ترے لبوں سے نہ آئے لبِ سبو پہ خراش

میں جانتا ہوں کہ رندوں کی آرزو تو ہے
مجھے خبر ہے تمنائے چار سو تو ہے

سید منظور الحسن

نیا لباس

[مسند احمد کی روایت، رقم 305 سے ماخوذ]

روایت ہے مسند میں پڑھنے کے لائق
پڑھے اِس کو ہر علم و دانش کا شائق
اِسے بو امامہ بیاں کر رہے ہیں
نہاں رازِ ہستی عیاں کر رہے ہیں
ملا جب نیا کپڑا حضرت عمرؓ کو
دعا مانگ کر، ہم سے کہنے لگے وہ:
پیمبرؐ کا اُسوہ جو مجھ کو ملا ہے
ہمیشہ عمل میں نے اُس پر کیا ہے
پیمبرؐ نے ہم سے یہ فرمایا اک دن
محبت سے، شفقت سے سمجھایا اک دن:
”نیا کپڑا جب بھی پہننے لگو تم
تو تعریف اپنے خدا کی کرو تم
کہو ذاتِ حق ہے پرستش کے لائق

وہی سب سے افضل، وہی سب سے فائق
اُسی سے ہر اک چیز ہم مانگتے ہیں
اُسی کی عنایت سے تن ڈھانپتے ہیں
پرانا لباس اپنا پھر تم اتارو
کسی فردِ محتاج کو جا پکارو
اُداسی کی تصویر میں رنگ بھر دو
پرانا لباس اُس کو خیرات کر دو
اگر تم سدا اِس روش پہ چلو گے
تو اپنی ترقی کا ساماں کرو گے
خدا کی پنہ تم کو حاصل رہے گی
قیامت کے دن کامیابی ملے گی"

شاہد محمود

خبر نامہ ”المورد امریکہ“

[نومبر 2023]

حدیث کے مشمولات اور اس کی حیثیت

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام گذشتہ کچھ عرصے سے 23 اعتراضات کی ویڈیو سیریز میں ”حدیث کیا ہے؟“ کے موضوع پر بحث چل رہی ہے۔ ماہ نومبر کے مہینے میں اس موضوع کے تحت حدیث کے مشمولات اور اس کی حیثیت پر گفتگو ہوئی۔ اس میں غامدی صاحب نے بتایا کہ حدیث میں کون سی چیزیں بیان ہوتی ہیں اور جب کسی حدیث کے ذریعے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فیصلہ ہم تک پہنچ جائے تو اس کی کیا حیثیت ہو گی۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہے۔

”اسرا و معراج“، ”شق القمر“ اور ”نزول مسیح“

یہ المورد، امریکہ کے ریسرچ اسکالر اور ماہنامہ ”اشراق، امریکہ“ کے مدیر سید منظور الحسن کی تالیفات ہیں۔ ان کو منظور الحسن صاحب نے ”غامدی صاحب کے فکر پر 23 اعتراضات کے جواب میں“ کی اقساط سے اخذ کر کے تحریر کیا ہے۔ مصنف نے ان کتابوں میں روایتی نقطۂ نظر کی تشریح کی ہے، اُس کے دلائل کا تجزیہ کیا ہے اور اُس کے مقابل میں غامدی صاحب کے موقف کو پوری

وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔

مزید برآں تفصیلی بحثیں اجزا میں تقسیم کی ہیں اور اشارات کی وضاحت اور اجمالی نکات کی تفصیل کی ہے۔ حسبِ موقع غامدی صاحب کی تصانیف سے متعلقہ اقتباس نقل کیے ہیں۔ تشریح و توضیح اور تائید و تاکید کے لیے جلیل القدر اہل علم کی کتابوں کے حوالے بھی درج ہیں۔ یہ تینوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور مارکیٹ میں دستیاب ہیں۔

''قصر نماز''

یہ محمد حسن الیاس صاحب کا مضمون ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے قصر نماز کے حوالے سے سورۂ نسا کی آیت 101 کو زیر بحث لاتے ہوئے بیان کیا ہے کہ جنگ کے سفر میں پیدا ہونے والی افراتفری اور پریشانی والی کیفیت اگر دوسرے کاموں میں پیدا ہو جائے تو عقل کا تقاضا ہے کہ ان کاموں میں بھی نماز میں کمی کی رخصت دی جانی چاہیے۔ سیدنا ابن عباس کی ایک روایت سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی عقلی اور فطری اصول کو سامنے رکھ کر اس آیت سے قیاس کیا ہے کہ عام سفروں میں اضطراب، افراتفری اور پریشانی سے اندیشہ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، لہٰذا وہاں بھی نماز کو قصر کیا جا سکتا ہے۔ یہ مضمون ''اشراق، امریکہ'' کے نومبر کے شمارے میں پڑھا جا سکتا ہے۔

ہفتہ وار درس قرآن و حدیث

نومبر کے مہینے میں غامدی سینٹر کے زیر اہتمام جناب جاوید احمد غامدی کے لائیو درسِ قرآن و حدیث کی 16 نشستوں کا انعقاد ہوا۔ غامدی صاحب نے ان نشستوں میں سورۂ نحل (16) کی آیات 96 تا 115 کا درس دیا۔ درسِ حدیث میں ''توہم پرستی''، ''اتمام حجت اور عذاب'' اور ''جنت کی حور'' جیسے اہم موضوعات زیر بحث آئے۔ قرآن و حدیث کے دروس کی یہ نشستیں غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہیں۔

''دین کے طلبہ کے لیے غامدی صاحب کا پیغام''

یہ مضمون جناب جاوید احمد غامدی کی گفتگو سے ماخوذ ہے جو انھوں نے ملایشیا میں مختصر قیام کے

دوران میں انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی میں زیر تعلیم پی ایچ ڈی کے طلبہ سے کی۔ مصنف نے اس مضمون میں غامدی صاحب کی طلبہ کو کی گئی نصیحتوں کو ضروری حک و اضافے کے بعد درج کیا ہے۔ اس مضمون کو ''اشراق، امریکہ'' کے نومبر کے شمارے میں دیکھا جاسکتا ہے۔

''الاسلام'' اور ''مقامات'' کا عربی میں ترجمہ

جاوید احمد غامدی صاحب کے افکار کو عالم عرب سے متعارف کرانے کے لیے اُن کی کتابوں کے عربی تراجم کا آغاز کیا گیا ہے۔ اِس سلسلے کا پہلا قدم ''الاسلام'' اور ''مقامات'' ہیں۔ یہ دونوں کتابیں ''غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ'' اور عالم اسلام کے مشہور مکتبہ ''دار القلم'' کے اشتراک سے شائع ہو گئی ہیں اور مارکیٹ میں دستیاب ہیں۔ ان کتابوں کے ای ورژن بھی تیار ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر خالد ظہیر کا پروگرام

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام ڈاکٹر خالد ظہیر کے سوال و جواب کے ہفتہ وار پروگرام کا کینیڈا سے آغاز ہو چکا ہے۔ اس پروگرام کے میزبان ملک فیصل اسلم صاحب لوگوں کی طرف سے بھیجے گئے سوالات ڈاکٹر خالد ظہیر کے سامنے رکھتے ہیں اور خالد ظہیر صاحب قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کے جوابات دیتے ہیں۔ اس پروگرام کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہے۔

23 اعتراضات کی ویڈیو سیریز کا انگریزی زبان میں خلاصہ

اس ویڈیو سیریز میں غامدی صاحب کے افکار پر روایتی مذہبی فکر کی طرف سے کیے گئے اعتراضات اور تنقیدات کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر شہزاد سلیم اس سیریز میں اب تک کے زیر بحث آنے والے تمام موضوعات کا انگریزی زبان میں خلاصہ بیان کریں گے، جو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر سلسلہ وار نشر کیا ئے گا۔

مدرسۃ الاصلاح کا قیام

''حیات امین'' کے عنوان سے مولانا امین احسن اصلاحی کی سوانح سلسلہ وار ''اشراق، امریکہ'' میں شائع ہو رہی ہے۔ گذشتہ ماہ اس کی تیسری قسط شائع ہوئی۔ اس میں نعیم بلوچ صاحب نے

مولانا کے مدرستہ الاصلاح میں داخلے اور وہاں پر ابتدائی تعلیمی مشکلات کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ مدرستہ الاصلاح کے قیام، منہج، نصاب اور تعلیمی مقاصد کو بھی بیان کیا ہے۔ مضمون کے آخر میں مصنف نے مدرستہ الاصلاح کے حوالے سے اپنے تاثرات کو بھی بیان کیا ہے۔

شہزاد سلیم صاحب کے نجی مشاورتی سیشن

شہزاد سلیم صاحب ہر ماہ لوگوں سے نجی طور پر ملاقاتیں کرتے ہیں۔ ان ملاقاتوں میں لوگ اپنے مختلف ذاتی اور خاندانی نوعیت کے مسائل میں شہزاد سلیم صاحب سے مشاورت کرتے ہیں۔ گذشتہ ماہ ڈاکٹر شہزاد سلیم نے مختلف لوگوں کے ساتھ 15 پرائیویٹ سیشن کیے۔ ان ملاقاتوں میں لوگوں نے شہزاد سلیم صاحب سے والدین کو درپیش مشکلات اور نوعمری اور ازدواجی مسائل کے حل کے لیے مشاورت کی۔

''میرا کیا بنے گا؟''

یہ سوال غامدی سینٹر کے ہفتہ وار پروگرام ''سوال وجواب سید منظور کے ساتھ'' میں زیر بحث آیا ہے۔ زندگی کے بعد موت، موت کے بعد دوبارہ زندگی میں کیا حکمت ہے اور موت کے بعد کیا معاملات ہوں گے، یہ اور اس طرح کے مختلف سوالات پر اس پروگرام میں گفتگو ہوئی ہے۔ یہ اور اس سلسلے کے دیگر اپی سوڈ ہمارے یوٹیوب چینل پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ ہفتہ وار پروگرام ہے، جو ہر جمعہ کے روز پاکستانی وقت کے مطابق رات 9 بجے نشر ہوتا ہے۔

حسن الیاس صاحب کا ''شبان المسلمین'' کے سالانہ اجتماع سے خطاب

گذشتہ ماہ جناب حسن الیاس نے ڈاکٹر اسرار احمد کی فکر پر مبنی تنظیم ''شبان المسلمین'' کے سالانہ اجتماع میں آن لائن شرکت کی۔ حسن الیاس صاحب نے ''جوابی بیانیہ'' کے زیر عنوان گفتگو کرتے ہوئے نہایت مربوط، موثر اور منظم انداز میں سامعین کے سامنے اپنا موقف رکھا۔ اور آخر میں سامعین کی طرف سے کیے جانے والے سوالات کے تسلی بخش جواب دیے۔

''البیان'' اور ''میزان'' کے انگریزی زبان میں لیکچرز

غامدی صاحب کی تفسیر قرآن ''البیان'' اور اسلام پر ان کی کتاب ''میزان'' کی انگریزی زبان

میں تدریس کا سلسلہ جاری ہے۔ پچھلے ماہ ''البیان'' کی 4 نشستوں کا انعقاد ہوا، جن میں سورۂ بقرہ کی آیات 142 تا 185 زیر بحث آئیں۔ ''میزان'' سیریز کے تحت ''The Social Shariah'' کے عنوان سے ڈاکٹر شہزاد سلیم نے دو لیکچرز ریکارڈ کیے۔ یہ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

''ذوالفقار علی بھٹو ــــ بیانیہ، شخصیت اور تاثرات''

اس موضوع کا آغاز غامدی سینٹر کے زیر اہتمام ہر ماہ ہونے والی ہفتہ وار سوال و جواب کی براہ راست نشست میں گذشتہ ماہ کیا گیا۔ اس میں ذوالفقار علی بھٹو صاحب کی شخصیت، ان کے سیاسی اور فکری پس منظر اور ان کے اقتدار سے لے کر زوال تک کے حالات پر بات کی گئی ہے۔ ماہ نومبر میں اس موضوع کے 2 پروگرام ریکارڈ ہوئے، جو ادارے کے یوٹیوب چینل پر دیکھے جاسکتے ہے۔

ڈاکٹر عمار خان ناصر کا غامدی سینٹر کا دورہ

دیوبندی فکر کے معروف عالم دین سرفراز خان صاحب کے پوتے، علامہ زاہد الراشدی کے صاحبزادے اور محقق عالم ڈاکٹر عمار خان ناصر گذشتہ ماہ غامدی سینٹر کی دعوت پر وہاں پہنچے۔ ان کی آمد کا مقصد جاوید احمد غامدی صاحب کی زیر نگرانی حدیث پراجیکٹ کے پہلے مجموعے ''علم النبی'' کی نظر ثانی اور بہتری کے عمل میں شریک ہونا اور اہم سوالات سے متعلق غامدی صاحب سے استفادہ کرنا تھا۔ مزید برآں انھوں نے غامدی سینٹر کے اسٹوڈیو میں اپنی کتابوں کی آڈیو ریکارڈنگ بھی کرائی۔

''البیان'' ترجمۂ قرآن کی آڈیو بک

غامدی سینٹر نے تذکیر بالقرآن پراجیکٹ کے تحت پہلی بار قرآن مجید کو ایک سال میں سنانے کا اہتمام کیا ہے۔ قرآن مجید کی تلاوت مشاری راشد العفاسی کی آواز میں ہے، جب کہ جاوید احمد غامدی صاحب کے ترجمۂ قرآن کو شاہ نواز صاحب نے اپنی دل کش آواز میں ریکارڈ کرایا ہے۔ ہر ہفتے اس کی ایک قسط غامدی سینٹر کے یوٹیوب پر نشر کی جاتی ہے۔ گذشتہ ماہ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر اس کی چار اقساط نشر ہوئی ہیں۔

Lessons of Life Series

Lessons of Life Series کے زیر عنوان شہزاد سلیم صاحب نے گذشتہ ماہ انگریزی زبان میں 9 لیکچر زریکارڈ کرائے۔ ان کے موضوعات یہ ہیں: ”آیئے ہارنے سے انکار کریں“، ”دنیا کے شہری“، ”زندگی میں جذبہ اور مقصد تلاش کرنا“، ”شکریے کا کلچر“، ”معاف کرنے کا کلچر“، ”آیئے اپنی زندگی کے ہر لمحے سے لطف اندوز ہوں“، ”مقدس گنہگار“، ”ایمانداری کی جنگ“، ”خوشگوار ازدواجی زندگی کے بنیادی عوامل“، ”اچھے انسان کیسے بنیں؟“۔ یہ لیکچرز غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

دینی آرا پر مبنی فتاویٰ کا اجرا

شریعت کے قانونی اطلاقات کے حوالے سے لوگ اکثر غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ سے رابطہ کرتے ہیں۔ انھیں نکاح و طلاق، وراثت (inheritance) اور بعض دیگر معاشی اور معاشرتی پہلوؤں سے اطلاقی آرا کی ضرورت ہوتی ہے۔ گذشتہ ماہ اسی نوعیت کی مختلف ضرورتوں کے تحت 5 فتوے جاری کیے گئے۔ انھیں جناب جاوید احمد غامدی کی رہنمائی میں محمد حسن الیاس نے جاری کیا۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن پر ڈاکومینٹری

ڈاکٹر فضل الرحمٰن علمی دنیا میں اپنے علم و فضل اور جدید خیالات کی وجہ سے بہت نمایاں شخصیت تھے۔ انھوں نے مشرق و مغرب، دونوں خطوں کو اپنے افکار اور تحقیق سے بہت متاثر کیا ہے۔ ان کا تعلق پاکستان کے صوبہ خیبر پختونخوا کے ضلع ہزارہ سے تھا۔ غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ نے محمد حسن الیاس صاحب کی زیر نگرانی ان پر ایک ڈاکومینٹری کا سلسلہ شروع کیا ہے، جس میں ان کی نجی زندگی، علمی و فکری پس منظر اور ان کے شخصی محاسن کو بیان کیا جائے گا۔ گذشتہ ماہ اس سلسلے کی ایک قسط نشر کی گئی، جسے ادارے کے یوٹیوب چینل پر دیکھا جاسکتا ہے۔

Ask Dr. Shehzad Saleem

یہ سوال و جواب کی لائیو ماہانہ نشست ہے، جس میں ڈاکٹر شہزاد سلیم لوگوں کے ذہنوں میں اٹھنے والے مختلف دینی، اخلاقی اور معاشرتی موضوعات سے متعلق سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔

اس نشست میں لوگ اردو اور انگریزی، دونوں زبانوں میں اپنے سوال پوچھ سکتے ہیں۔ اس کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جاسکتی ہے۔

''تنقیداتِ غامدی''

جاوید احمد غامدی صاحب کا کہنا ہے کہ سچا طالب علم ہمیشہ اختلاف کا استقبال اور تنقید کا خیر مقدم کرتا ہے۔ اگر کسی طالب علم کے اندر اپنے اوپر ہونے والی تنقید سے بیداری پیدا نہیں ہوئی تو وہ گویا سچا طالب علم ہی نہیں رہا۔ اسی سوچ اور جذبے کی وجہ سے غامدی سینٹر نے ''تنقیدات غامدی'' کے زیر عنوان روایتی مذہبی فکر کی جانب سے غامدی صاحب کی فکر پر ہونے والے تمام علمی و فکری اعتراضات اور تنقیدات کو یکجا کر دیا ہے۔ یہ تمام تنقیدات غامدی سینٹر کی ویب سائٹ پر دیکھی جاسکتی ہیں۔

''گالی کا جواب''

سید منظور الحسن فضائل اخلاق پر مبنی احادیث مبارکہ کو نظم کی صورت میں پیش کر رہے ہیں۔ ماہ نومبر کے شمارے میں انھوں نے مسند احمد کی روایت، رقم 9662 کو ''گالی کا جواب'' کے عنوان سے نظم کی صورت میں پیش کیا۔ نظم کے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

کہا بہ حضورِ رسالت مآب
نہ دوں گا کبھی گالیوں کا جواب
سدا صبر و برداشت دکھلاؤں گا
نبیؐ کا میں اخلاق اپناؤں گا

''نظم قرآن کا تصور''

''علم و حکمت: غامدی کے ساتھ'' دنیا نیوز چینل پر چلنے ولا غامدی صاحب کا ہفتہ وار ایک معروف پروگرام ہے، جو کئی برس سے نشر ہو رہا ہے۔ یہ ڈیلس میں ریکارڈ ہوتا ہے اور اس کی میزبانی کے فرائض حسن الیاس صاحب انجام دیتے ہیں۔ نومبر کے مہینے میں اس پروگرام میں ''نظم قرآن کا تصور'' کے عنوان سے 4 پروگرام ریکارڈ کیے گئے اور دنیا نیوز سے نشر ہوئے۔ ان

پروگراموں میں نظم قرآن کے تصور اور اس پر اٹھائے جانے والے تنقیدی سوالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

”اسلام اسٹڈی سرکل“

گذشتہ ماہ ”اسلام اسٹڈی سرکل“ پروگرام میں قرآن مجید، حدیث اور بائیبل کے جو موضوعات زیر بحث رہے، ان کے عنوانات بالترتیب یہ ہیں: ”جوڑا جوڑا پیدا کرنا“، ”لوگوں کے لیے سہولت“ اور ”پڑوسیوں کے حقوق“۔